مجلہ طلوع اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ

لاہور

قیمت فی پرچہ
15/-
روپے

ٹیلیفون
5714546/5753666
idara@toluislam.com
خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) بی ۲۵ گلبرگ ۲ لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان۔170 روپے
غیر ممالک۔800 روپے

جلد 52 | اکتوبر 1999ء | شمارہ نمبر 10

Bank Account No. 3082-7, National Bank of Pakistan, Main Market Gulberg Branch, Lahore

ادارت

مدیر:
محمد سلیم اختر

مجلس مشاورت

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر (اردو سیکشن)
محترمہ شمیم انور (انگلش سیکشن)

سرکولیشن مینجر : مرزا محمد زمرد بیگ
کمپوزر : شعیب حسین

انتظامیہ

چیئرمین :- ایاز حسین انصاری
ناظم :- محمد سلیم اختر
ناشر :- عطا الرحمان ارائیں

قانونی مشیران

جناب عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ
جناب ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ
جناب محمد اقبال چوہدری ایڈووکیٹ

پرنٹرز : آفتاب عالم پریس 13 ہسپتال روڈ لاہور---فون : 7232584

فہرست

لمعات	ادارہ	3
شراب کہن	علامہ غلام احمد پرویز	7
شاہکار رسالت	آغا شورش کاشمیری (مرحوم)	17
اگلا قدم	بشیر احمد عابد	21
دعا	ادارہ	27
کافرگری	اقبال ادریس مینگورہ	33
عقیدت کے پھول	علی محمد چدھڑ	37
اہل مذہب کی خدمت میں	خورشید ندیم	41
حقائق وعبر	ادارہ	44

ENGLISH SECTION

Conflicts and Contradictions In Human Thought and the approach to the Quran 64

By
Prof. Dr. Manzoor-ul-Haque

Compulsion In Islam 56

By
Prof. Muhammad Rafi

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

فتنہ انکار حدیث

آج سے ذرا پہلے تک ہمارے ہاں علمائے شریعت کی بالعموم یہ کیفیت تھی کہ وہ اپنے حقائق میں بڑے پختہ اور متشدد تھے اور مخالف فرقے کے معتقدات پر کڑی سے کڑی تنقید کرتے تھے لیکن اس تنقید میں ان کا مسلک یہ ہوتا تھا کہ مخالف کے حقائق کو اسی کے الفاظ میں بیان کرتے اور پھر ان کی تردید کرتے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ خود اپنے ذہن سے مخالفین کے عقائد کو وضع کرتے اور پھر انہیں بنائے اعتراضات بنا لیتے۔ وہ خدا سے ڈرتے تھے اور اس قسم کی حرکات کو دیانت اور تقویٰ کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن ہمارے دور کے مدعیان شریعت کی کیفیت بالعموم ان سے مختلف ہے۔ اب یہ فریق مخالف کے متعلق خود ہی کچھ باتیں وضع کرتے ہیں اور ان باتوں کو اس کی طرف منسوب کرکے سب و شتم کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ وہ بے چارہ لاکھ چلائے کہ یہ میرے معتقدات نہیں اس کی ایک نہیں سنتے۔ اپنا پروپگنڈہ بدستور جاری رکھتے ہیں۔ اس کی ایک بین مثال لیجئے۔ طلوع اسلام کو ایک عرصہ سے منکر حدیث اور منکر سنت قرار دے کر ہدف طعن و تشنیع بنایا جا رہا ہے اور یہ سب کچھ ان حقائق کی بنا پر کیا جا رہا ہے جو طلوع اسلام کے نہیں ہیں بلکہ ان پروپگنڈہ کرنے والوں نے خود ہی اپنے ذہن سے تراش رکھے ہیں۔

کیا آپ نے کبھی اس پر سنجیدگی سے غور فرمایا ہے کہ بالآخر یہ انکار حدیث و سنت ہے کیا؟ چونکہ اس طعن کا ہدف اولیں طلوع اسلام ہے اس لیے ہم نے قریب قریب ہر اس تحریر کو پڑھا ہے جو اس باب میں اب تک صفحہ قرطاس پر آئی ہے۔ اس لیے پڑھا ہے کہ ہم جاننا چاہتے تھے کہ وہ کونسا جرم ہے جس کا مرتکب طلوع اسلام ہو رہا ہے اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ فی الواقعہ جرم ہے تو ہم اس سے خدا کے حضور تائب ہو کر اپنی اصلاح کر لیں۔ لیکن ہم بغیر کسی قسم کی مناظرانہ جنبہ داری کے نہایت دیانتداری سے عرض کرتے ہیں کہ آج تک کوئی ایسا مضمون ہماری نظر سے نہیں گذرا جس میں متانت اور سنجیدگی سے، دینی اور علمی نقطہ نظر سے یہ بتایا گیا ہو کہ "فتنہ انکار حدیث" کیا ہے اور طلوع اسلام کا وہ کونسا جرم ہے جس کی پاداش میں اسے... مورد طعن و تشنیع بنایا جا رہا ہے؟ اگر آپ ہمارے اس قول کو باور نہ کریں تو ہم آپ سے گذارش کریں گے کہ آپ ہی ہمارے لیے کسی ایسے مقالہ کی نشاندہی کر دیجئے جس میں اس موضوع پر علمی اور دینی حیثیت سے گفتگو کی گئی ہو۔ ایسا کرتے وقت ذیل کی تصریحات کو اپنے زیر نظر رکھئے۔

حدیث کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ اس کا مطلب ہے "انکار حجت حدیث" لیکن یہ تو صرف وہ لفظ [illegible]

لفظوں کا استعمال ہے۔ بات تو اس سے بھی واضح نہیں ہوتی۔ جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں' حجت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جب کسی مختلف فیہ مسئلہ میں اس قول کو پیش کر دیا جائے تو اسے قول فیصل مان لیا جائے اور اس پر کسی قسم کی تنقید جائز نہ سمجھی جائے۔ مثلاً جب یہ سوال زیر غور ہو کہ اسلام میں لحم خنزیر کا کھا لینا جائز ہے یا نہیں اور کوئی شخص یہ کہہ دے کہ قرآن میں ہے کہ **حرمت علیکم..... ولحم الخنزیر** (تم پر سور کا گوشت حرام کیا گیا ہے) تو یہ آیت مسئلہ زیر نظر کے فیصلہ کے لیے قول فیصل کا حکم رکھے گی اور اس پر کسی تنقید کی گنجائش نہیں رہے گی۔ اسے دین میں حجت کہتے ہیں۔ قرآن کی ہر آیت' ہر مسلمان کے لیے حجت دینی ہے۔ جو مسلمان ان میں سے کسی ایک آیت کو بھی حجت نہیں مانتا وہ "منکر قرآن" ہے اور اس کا مسلک "فتنہ انکار قرآن"۔

سوال یہ ہے کہ کیا آج تمام روئے زمین پر کوئی مسلمان ایسا ہے یا گذشتہ تیرہ سو سال میں کوئی مسلمان ایسا گذرا ہے جو ہر حدیث کو اسی طرح دین میں حجت مانتا ہو؟ حدیث کے معنی ہیں قول منسوب الی الرسول۔ یعنی ایسی بات جسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہو۔ احادیث کی مقدار لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا "فتنہ انکار حدیث" کے داعیوں میں سے کوئی شخص بھی ایسا ہے جو ان لاکھوں احادیث میں سے ہر حدیث کو دین میں حجت مانتا ہو' جس طرح وہ قرآن کی ہزاروں آیتوں میں سے ہر آیت کو حجت مانتا ہے؟ مثلاً اہل شیعہ کے ہاں یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنا وصی اور جانشین مقرر فرمایا تھا۔ سنیوں میں سے کوئی شخص بھی اس حدیث کو مسئلہ خلافت میں حجت نہیں مانتا۔ یا سنیوں کے ہاں حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ میرے ترکہ کا وارث کوئی نہیں۔ لیکن شیعوں میں سے کوئی بھی اس حدیث کو باغ فدک کے معاملہ میں حجت نہیں مانتا۔ اسی طرح خود سنیوں کے مختلف فرقوں کا حال ہے۔ رفع یدین کے مسئلہ میں حنفی جس حدیث کو حجت مانتے ہیں اہل حدیث اسے حجت نہیں مانتے اور جس حدیث کو اہل حدیث حجت قرار دیتے ہیں' حنفی اسے حجت نہیں مانتے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا الگ الگ وجود اسی بنیاد پر قائم ہے کہ جو احادیث ایک کے ہاں حجت ہیں وہ دوسروں کے ہاں حجت نہیں۔ لہٰذا (جیسا کہ اوپر کہا گیا) یہ حقیقت واضح ہے کہ اس تیرہ سو برس میں کوئی مسلمان ایسا نہیں گزرا اور نہ ہی آج کوئی مسلمان ایسا ہے جو لاکھوں احادیث میں سے ہر حدیث کو حجت دینی سمجھتا ہو۔

کہا یہ جاتا ہے کہ ہر حدیث کو حجت دینی سمجھنے کا مطالبہ نہیں۔ صرف صحیح احادیث کو حجت سمجھنے کا مطلب ہے جو صحیح حدیث کو حجت نہیں سمجھتا وہ منکر حدیث ہے لیکن سوال یہ ہے کہ صحیح حدیث کہتے کسے ہیں؟ شیعہ حضرات اپنی احادیث کو صحیح قرار دیتے ہیں لیکن سنیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کسی حدیث کے سلسلہ رواۃ میں ایک شیعہ راوی بھی آ جائے تو وہ حدیث صحیح نہیں قرار دی جاسکتی۔ یعنی سنی' شیعہ حضرات کی صحیح احادیث کو حجت نہیں مانتے لیکن اس کے باوجود منکر حدیث قرار نہیں پاتے۔ اسی طرح سنیوں کی صحیح احادیث کو شیعہ حجت دینی نہیں مانتے لیکن سنیوں کے نزدیک وہ بھی منکر حدیث نہیں قرار دیئے جاتے۔ خود سنیوں کے ہاں یہ کیفیت ہے کہ جن احادیث کو غیر مقلد حضرات صحیح قرار دیتے ہیں' انہیں غیر مقلد حجت نہیں مانتے۔ لیکن انہیں بھی کوئی منکر حدیث نہیں کہتا۔

سنیوں کے ہاں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ بخاری شریف ایک ایسی کتاب ہے جس کی ہر حدیث صحیح ہے لیکن سنیوں میں وہ حضرات موجود ہیں جو بخاری کی ہر حدیث کو بھی حجت دینی نہیں مانتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بھی منکر

قرار نہیں پاتے۔
یہ حقائق ہیں جن سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ ان کی روشنی میں یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ہر
فرد' صرف ان احادیث کو حجت شرعی سمجھتا ہے جنہیں وہ اپنے خیال میں صحیح خیال کرتا ہے' جنہیں وہ صحیح نہیں
وہ حجت نہیں مانتا اور اس کے اس انکار سے اسے منکر حدیث قرار نہیں دیا جاتا۔ مثلاً سو احادیث کے مجموعہ میں
ایک شخص پہلی پچاس کو صحیح نہیں سمجھتا۔ اسے آپ منکر حدیث قرار نہیں دیں گے۔ دوسرا شخص' آخری پچاس کو صحیح
سمجھتا اسے بھی آپ منکر حدیث قرار نہیں دیں گے۔ اب اگر ایک تیسرا شخص ایسا ہو جو یہ کہے کہ مجھے تو ان سو
احادیث میں سے ایک بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی' تو کیا اسے منکر حدیث قرار دیا جائے گا؟ اگر اسے ایسا قرار دیا جائے گا تو
کیں؟ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شخص فلاں مجموعہ احادیث کو صحیح نہیں سمجھتا (جیسے شیعہ حضرات' سنیوں کی احادیث کو
صحیح نہیں سمجھتے اور سنی حضرات شیعوں کی احادیث کو صحیح نہیں مانتے)۔
ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ اگر کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ فلاں حدیث فی الواقعہ رسول اللہ ﷺ کی ہے' تو جو
اسے دینی حجت نہ سمجھے' اسے منکر حدیث کہا جائے گا۔ اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ثابت کس طرح کیا جاسکے گا
کہ فلاں حدیث فی الواقعہ رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ آپ کہدیں گے کہ آئمہ حدیث نے اس کے اصول مقرر کر رکھے ہیں
لیکن انہی اصولوں کے مطابق تو شیعہ حضرات' سنیوں کی احادیث کو رد کرتے ہیں' اور سنی حضرات' شیعوں کی احادیث کو۔
ممکن ہے کہ کہہ دیا جائے کہ سنیوں کے اصول الگ ہیں اور شیعوں کے الگ۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ احادیث کے
پرکھنے کے الگ الگ اصول بنا لینے سے بھی کوئی فرقہ (یا کوئی شخص) منکر حدیث قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ اصول انسانوں
ہی کے بنائے ہوئے ہیں لیکن اس سے بھی آگے بڑھیے۔ مقلد اور غیر مقلد حضرات کے ہاں تو احادیث کے پرکھنے کے اصول
ایک ہی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں بھی احادیث کے صحیح قرار دیئے جانے میں اختلاف ہے۔ لہٰذا یہ بھی غلط ہے کہ
احادیث کے پرکھنے کے جو اصول مروج ہیں ان کی رو سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ فلاں قول فی الواقع رسول اللہ ﷺ کی
حدیث ہے۔ اگر یہ ثابت کیا جاسکتا تو جو لوگ ان اصولوں کو مانتے ہیں کم از کم ان کے ہاں تو اس بات میں اختلاف نہ ہوتا کہ
فلاں حدیث صحیح ہے یا نہیں۔ انہی اصولوں کے مطابق بخاری شریف' احادیث کی صحیح ترین کتاب قرار پائی تھی۔ لیکن اس
کے متعلق بھی یہ کہا جا رہا ہے کہ اس کی ہر حدیث صحیح نہیں ہے اور ایسا کہنے والوں کو منکر حدیث نہیں کہا جاتا۔
یہ وہ سوالات ہیں جو "انکار حدیث" کے سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان حضرات سے جنہیں دین کا علم' تقویٰ اور دیانت
نصیب ہے ہم باادب اور بزور گزارش کریں گے کہ وہ خالص علمی اور دینی حیثیت سے ان سوالات پر غور فرمائیں اور
کسی بحث میں الجھے بغیر ہمیں بتائیں کہ منکر حدیث کسے کہتے ہیں۔ کون سی حدیث دین میں حجت قرار دی جاسکتی ہے
ایسا قرار دینے کے دلائل اور سند کیا ہے۔ اس کے لیے وہ اصطلاحات کے استعمال پر اکتفا نہ کریں بلکہ جس انداز سے
سوالات پیش کئے ہیں اسی انداز سے عملی مثالوں سے اپنے خیال کی وضاحت فرمائیں۔ اگر ان کی تکلیف فرمائی سے
صاف اور طلوع اسلام پر اس کی غلطی واضح ہو جائے تو اس کے لیے وہ ہمارے نزدیک مشکور اور خدا کے ہاں

-:-----------------:-

طلوع اسلام کا ذکر ہائی کورٹ میں

ہائی کورٹ مغربی پاکستان کے ایک فاضل جج نے 19 ستمبر 1957ء کو مقدمہ۔ غلام بھیک بنام مسمات حسین بیگم۔ میں اپنے فیصلہ کے دوران میں تحریر فرمایا :

اسلامی شریعت کے چار مسلمہ مآخذ ہیں۔ قرآن۔ حدیث (جسے بعض کے نزدیک سنت بھی کہا جاتا ہے) قیاس (یعنی نصوص سے استنباط مسائل) اور اجماع (یعنی کسی خاص مسئلہ میں ایک زمانے کے مجتہدین کا متفق ہو جانا)۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کے احکام کی تفسیر میرے پیش نظر نہیں۔ ان احکام کو بالعموم غیر متبدل تسلیم کیا جاتا ہے اگرچہ بعض تفاصیل میں ان کی تعبیر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اصل دشواری حدیث کے بارے میں پیش آتی ہے جو سنت یا عمل رسول اللہ ﷺ کا ریکارڈ ہے۔ قطع نظر اس کے کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی خاص معاملہ کے متعلق حدیث کے مستند یا غیر مستند ہونے کا سوال مختلف فیہ نہ ہو بعض صورتوں میں خلفائے راشدین بالخصوص حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے تسلیم شدہ طریقہ سے اختلاف کیا ہے۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں ادارہ طلوع اسلام (کراچی) کی طرف سے شائع کردہ کتاب

اسلام میں قانون سازی کا اصول

میں دی ہوئی ہیں۔ یہ کتاب ایک اعلیٰ درجہ کی تالیف ہے جس سے میں نے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مبنی بر سنت شریعت اسلامی کی تعبیر کا صحیح طریق یہ ہوگا کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ جو جزئیات سنت کی رو سے متعین ہوئی ہیں ان میں زمان اور مکان کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ ایسا کہنے میں میں اظہار رائے نہیں کر رہا بلکہ جو کچھ ہوتا رہا ہے اسے بیان کر رہا ہوں۔ اس مقام پر مجھے یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ سنت کو مبنی بر وحی قرار دینے کے حق میں جو دلائل دیئے جاتے ہیں وہ محکم بنیادوں پر استوار نہیں۔ (P.L.D. 1957-- Lahore, 998)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شراب کہن

طلوع اسلام ستمبر 1979ء میں شراب کہن کے عنوان سے پرویز صاحب کے چھ خطبات شائع ہوئے تھے۔ ان خطبات کے سلیس انداز بیان اور افادی حیثیت کے پیش نظر ایک بار پھر ان خطبات کو قارئین طلوع اسلام کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ گذشتہ شمارہ میں اس سلسلہ کا دوسرا اور تیسرا خطبہ شائع ہو چکا ہے۔ اس دفعہ بقیہ آخری تین خطبات ملاحظہ فرمایئے۔ (مدیر)

افراد اور امت

قال اللہ تعالیٰ :

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران- آیت 109)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا- تم بہترین قوم ہو جسے تمام نوع انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے- سابقہ خطبہ میں یہ حقیقت آپ کے سامنے آچکی تھی کہ خدا کے قانون مکافات عمل کے مطابق ہر کام-- خواہ وہ دل میں گزرنے والا ارادہ ہی کیوں نہ ہو-- اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے- اس میں وقت تو ضرور لگتا ہے' جس طرح ایک بیج کو فصل بننے کے لئے وقت لگتا ہے- لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ بیج بویا جائے اور اس سے درخت بن کر پھل پیدا نہ ہو- یا بیج تو ہو کیکر کا لیکن اس پیڑ میں آم لگ جائیں-

لیکن یہ دیکھنے کی بات ہے کہ بیج' درخت کس طرح بنتا ہے--- بیج کو مٹی میں ملایا جاتا ہے- پھر اس میں پانی دیا جاتا ہے- اوپر سے سورج کی گرمی پہنچتی ہے- اس سے اس بیج میں سے کونپل نکلتی ہے- وہ ہوا سے غذا حاصل کرتی ہے اور آگے بڑھنا شروع ہو جاتی ہے- لہٰذا' بیج کے درخت بننے کے لئے اس کے ساتھ مٹی' پانی' حرارت' روشنی- ہوا کا ہونا ضروری ہے-

لیکن اگر آپ ایسا کریں کہ اعلیٰ قسم کا بیج لیں اور اسے برآمدے کے ایک کونے میں رکھ دیں- اس کے پاس ہی ایک صاف ستھری مٹی کا ڈھیر لگا دیں- ایک طرف پانی کی بالٹی بھر کر رکھ دیں- سورج کی دھوپ سے روشنی اور حرارت تو خود بخود ملتی جائے گی- ہوا بھی برآمدے میں موجود ہے- اس طرح وہ تمام چیزیں جمع ہو جائیں گی جن سے ہے- لیکن آپ سوچئے کہ اگر یہ چیزیں سو برس تک بھی اس طرح پڑی رہیں تو ان سے درخت تو ایک طرف' سکے گی؟ کبھی نہیں- یہ کیوں؟ اس لئے کہ جب تک یہ تمام چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ نہ ملیں' بیج میں

سے کونپل کبھی نہیں پھوٹ سکتی- بیج سے درخت بننے اور درخت میں پھل آنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ سب چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں- اور تعاون بھی اس قسم کا کہ یہ سب اپنی اپنی الگ ہستی کو ایک دوسرے کے اندر جذب کر کے ایک نئی شکل اختیار کر لیں- آم' کہ جس کی رنگت خوشبو اور ذائقہ اس قدر دلفریب اور روح افزا ہوتا ہے' مٹی- پانی- حرارت- روشنی اور ہوا ہی کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے- وہ انہی اجزاء سے بنتا ہے- لیکن آپ دیکھئے کہ نہ تو اس کے اندر کہیں یہ چیزیں اپنی اپنی شکل میں الگ الگ موجود ہوتی ہیں اور نہ ہی ان میں سے کسی شے میں آم کی رنگت- خوشبو اور شیرینی ہوتی ہے- اس سے ظاہر ہے کہ فطرت کا قانون یہ ہے کہ جب تک مختلف چیزیں باہمی تعاون نہ کریں اور ایک دوسرے کے اندر جذب نہ ہو جائیں کوئی نئی چیز پیدا نہیں ہوتی- اور جب یہ ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جائیں تو اس طرح جو نئی چیز بنتی ہے وہ ان تمام چیزوں سے نہایت ارفع اور اعلیٰ ہوتی ہے جن سے مل کر یہ نئی چیز بنتی ہے- آپ غور کیجئے کہ اس مٹی اور پانی کی قیمت اور حیثیت کیا تھی جن کے مل جانے سے آم بنا ہے- لیکن آم بن کر ان کی قیمت اور حیثیت کیا سے کیا ہو گئی-

جس طرح پانی- مٹی- ہوا- حرارت کے الگ الگ رہنے سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اسی طرح اگر کسی جگہ کے انسان بھی الگ الگ رہیں تو ان سے کوئی فائدہ بخش کام سرانجام نہیں پاتا- لیکن جب یہی افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں تو یہ دنیا میں ایسے ایسے کام کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے- جب افراد آپس میں مل جائیں تو ان سے قوم بن جاتی ہے- قرآن کریم میں اس کے لئے امت کا لفظ آیا ہے-

ہم نے دیکھا ہے کہ جب بیج- مٹی- پانی وغیرہ الگ الگ رہیں' خواہ وہ ایک ہی برآمدے کے اندر کیوں نہ ہوں' ان سے پودا نہیں بنتا- پودا بننے کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ چیزیں ایک دوسرے سے تعاون کریں بلکہ ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جائیں- عربی زبان میں اس طرح گھل مل جانے کو الفت کہتے ہیں- اس طرح' اگر کسی ملک کے افراد ایک دوسرے سے الگ الگ رہیں اور ہر ایک اپنے اپنے فائدہ کے پیچھے لگا رہے' تو انہیں قوم یا امت نہیں کہا جا سکتا- یہ اس وقت امت بنتے ہیں جب یہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور گھل مل کر رہیں- یعنی ان میں الفت پیدا ہو جائے- چنانچہ قرآن مجید میں مسلمانوں کے متعلق ہے کہ **وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا** "تم اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ (ایک وقت وہ تھا) جب تم الگ الگ تھے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے- پھر اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگے- اس طرح تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے- **وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا** تم تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے کہ اللہ نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا- **كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ** (آل عمران- آیت 102) اس طرح اللہ اپنے قوانین کو تمہارے فائدے کے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ زندگی اور کامیابی کا سیدھا راستہ تمہارے سامنے آجائے- دوسری جگہ ہے: **وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا**... (البقرہ- آیت 143)- "اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین امت (قوم) بنا دیا"- اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ قرآن مجید کی رو سے افراد اس وقت قوم بنتے ہیں جب ان کے دل ایک دوسرے میں گھل مل جائیں- جب ان کے مفاد ایک دوسرے کے مفاد میں جذب ہو جائیں- اگر ایسی صورت پیدا نہ ہو تو محض ایک مقام پر اکٹھے رہنے سے امت نہیں بن سکتی- قرآن کریم نے ایسے لوگوں کے لئے کہا ہے کہ **تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى**... (سورہ الحشر-

... تو سمجھتا ہے کہ وہ اکٹھے ہیں حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ ہیں"۔ **بَأسُهُم بَيْنَهُم شَدِيدٌ** ... کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی آپس میں سخت لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ **ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ** (59/13)۔ یہ ... یہ لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن مجید نے افراد کے قوم بننے کے لئے کیا کیا شرائط عائد کی ہیں۔ یہ کہ ان کے دل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ ان کے مفاد ایک دوسرے کے مفاد میں جذب ہوں۔ ان کا آپس میں کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ اور وہ جذبات سے مغلوب ہو کر یونہی آپے سے باہر نہ ہو جایا کریں بلکہ ہر معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کیا کریں۔ اس طرح جب مختلف افراد ایک قوم بن جاتے ہیں تو تمام افراد کی عزت اور پوزیشن ایک جیسی ہو جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ پھولوں کے پودوں میں کھاد ڈالی جاتی ہے۔ کھاد ایسی چیز ہے جس سے ہر شخص نفرت کرتا ہے۔ اس سے پرے پرے رہنا چاہتا ہے۔ لیکن وہی کھاد جب اپنے آپ کو مٹی اور پانی میں جذب کر دیتی ہے تو پھول بن جاتی ہے جسے ہر شخص سینے سے لگائے اور سر پر چڑھائے رکھتا ہے۔ کھاد کو اس قدر حسین۔ خوشبو دار۔ صاحب عزت' کس چیز نے بنا دیا؟ اس چیز نے کہ اس نے الگ رہنے کے بجائے اپنے آپ کو دوسرے اجزاء کے اندر جذب کر دیا۔ اسی طرح امت کے اندر جذب ہو جانے سے ہر فرد کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مٹھائی چار روپے سیر بکتی ہے۔ مٹھائی میں کیا کیا ہوتا ہے؟ میدہ' جس کی قیمت بارہ آنے سیر ہے۔ شکر (یعنی کھانڈ) جس کا نرخ ایک روپیہ فی سیر ہے۔ اگر میدہ الگ رہے اور شکر الگ رہے تو ان کی قیمت بارہ آنے اور ایک روپیہ فی سیر سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہ ہو۔ لیکن جب انہوں نے اپنے آپ کو دیگر اجزاء کے ساتھ ملا دیا تو ان کی قیمت بھی چار روپے فی سیر ہو گئی۔ اسی طرح جب افراد' اپنے آپ کو امت میں جذب کر دیتے ہیں تو سب افراد کی قیمت ایک جیسی ہو جاتی ہے۔ اس میں بڑے اور چھوٹے کا کوئی فرق نہیں رہتا۔ جو قیمت قوم کے سب سے بڑے فرد کی ہوتی ہے وہی قیمت قوم کے سب سے چھوٹے فرد کی ہوتی ہے ان میں تقسیم کار کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ کسی کے ذمے کوئی کام اور کسی کے ذمے کوئی۔ لیکن تقسیم کار سے افراد کی عزت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ عزت سب کی برابر ہوتی ہے۔ آپ گھڑی کو دیکھئے۔ اس میں مختلف پرزے ہوتے ہیں اور ہر ایک پرزے کے ذمے الگ الگ کام ہوتے ہیں۔ اس میں سو روپے کا ہیرے کا ریزہ بھی ہوتا ہے اور دو پیسے کا پیچ بھی۔ الگ الگ دیکھئے تو ہیرے کے مقابلے میں پیچ کی کوئی قیمت اور اہمیت نہیں ہوتی۔ لیکن گھڑی کے اندر پیچ کی اہمیت اس قدر ہوتی ہے کہ وہ اگر ذرا ڈھیلا ہو جائے اور اپنا کام چھوڑ دے تو ساری گھڑی بیکار ہو جاتی ہے اور بڑے سے بڑے پرزے کی اہمیت بھی کچھ نہیں رہتی۔ جب مختلف افراد باہمی جذب سے امت بنتے ہیں تو جو شخص چھوٹے سے چھوٹا کام کرے اس کی اہمیت بھی باقی پرزوں کے برابر ہوتی ہے۔ یہ ہندوؤں کا مذہب ہے جس میں برہمن کی عزت اور اہمیت الگ ہوتی ہے اور کھشتری کی الگ۔ ویش کی الگ ہوتی ہے اور شودر کی الگ۔ اسلام اس قسم کی کوئی تفریق نہیں کرتا۔ وہ تمام افراد کو ایک امت قرار دیتا ہے۔ جتنی اس امت کی قدر و منزلت ہوتی ہے اتنی ہر فرد کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ ان افراد کے دلی تعاون سے امت کا نظام قائم رہتا ہے۔ اور جیسا کہ پچھلے خطبہ میں بتایا گیا تھا' خدا کا قانون مکافات عمل اسی نظام کے ذریعے اپنے نتائج سامنے لاتا ہے۔ یہی نظام ہے جو ظالموں کی کلائیاں مروڑ کر عدل اور انصاف کی فضا قائم کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اگر ان ظالموں کے حوصلے دراز ہوتے چلے جاتے ہیں تو اس لئے کہ ہم ایک امت۔ ایک قوم کی حیثیت سے نہیں رہتے' افراد کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ یاد رکھئے! قرآن مجید نے ہمیں ایک امت بنایا ہے۔ افراد کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا مسلمان

شیوہ نہیں۔ مسلمان اس وقت مسلمان بنتا ہے جب وہ امت کی مشینری کا پرزہ بن کر رہتا ہے۔ جونہی وہ اس مشینری سے الگ ہوا' اسلام کا قلاوہ اس کی گردن سے اتر گیا۔

آئندہ خطبات میں یہ بتایا جائے گا کہ قرآن مجید کی رو سے مختلف افراد ایک امت کس طرح بنتے ہیں اور اس امت کا فریضہ زندگی کیا ہے۔ والسلام

افراد قوم کس طرح بنتے ہیں

قال اللہ تعالیٰ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (آل عمران۔ آیت 199)

ارشاد خداوندی ہے کہ اے افراد جماعت مومنین۔ تم خود بھی ثابت قدم رہو۔ اور دوسروں کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرو۔ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہو۔ اور (اس طرح سب مل کر) قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ تقویٰ شعار بنو تاکہ تم کامیاب زندگی بسر کر سکو۔

سابقہ خطبہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ اسلامی زندگی یہ ہے کہ تمام افراد باہم مل کر امت بن جائیں۔ اسلامی زندگی امت یا قوم بن کر رہنے کی زندگی ہے۔ الگ الگ رہنے اور اپنے اپنے مفاد کے پیچھے دوڑنے کی زندگی مسلمان کی زندگی نہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مختلف افراد ایک قوم کس طرح بنتے ہیں۔ الگ الگ مسلمان ایک امت کے دھاگے میں کس طرح پروئے جاتے ہیں۔ آج ہم اس اہم حقیقت کو آپ کے سامنے بیان کریں گے۔

آپ نے کبھی فٹ بال کا میچ دیکھا ہے؟ ضرور دیکھا ہو گا۔ اس میں ایک طرف گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں۔ یہ سب کھلاڑی میدان کے آدھے حصے میں بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ کوئی پیچھے۔ کوئی آگے۔ کوئی درمیان میں۔ کوئی دائیں۔ کوئی بائیں۔ کوئی سب سے اخیر ایک جگہ اکیلا کھڑا دکھائی دے گا۔ وہ اس طرح بکھرے ہوئے ہوتے ہیں' جیسے ایک کو دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اتنے میں سیٹی بجتی ہے اور بال میدان میں آجاتا ہے۔ یہ بکھرے ہوئے کھلاڑی بڑی تیزی سے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ میدان میں عجیب ہلچل مچ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا افراتفری کا عالم ہے۔ لیکن اس افراتفری اور ہلچل میں ایک چیز عجیب دکھائی دیتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے جس کے قریب بھی بال آجاتا ہے وہ اسے ایک خاص سمت کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ان میں سے ایک کھلاڑی بال کو مشرق کی طرف لے جائے اور دوسرے کی باری آئے تو وہ اسے مغرب کی طرف لے جائے۔ جس سمت کو یہ سب کھلاڑی بال کو لے جانا چاہتے ہیں' اسے انگریزی زبان میں گول کہتے ہیں۔ گول کے معنی ہیں نصب العین۔ منزل مقصود۔ وہ نقطہ جس پر سب کی نگاہ ہو۔ وہ چیز جسے سب مل کر حاصل کرنا چاہیں۔ کھلاڑی گیارہ ہوتے ہیں لیکن ان سب کے سامنے گول ایک ہی ہوتا ہے۔ جن کھلاڑیوں کے سامنے ایک مشترکہ گول ہو انہیں انگریزی زبان میں ٹیم کہتے ہیں۔

اسی طرح جب کسی جگہ کے رہنے والے انسانوں کے سامنے ایک مشترکہ نصب العین ہو تو انہیں قوم یا امت کہا جاتا ہے۔ لہٰذا' افراد اس صورت میں قوم بن سکتے ہیں جب ان سب کے سامنے ایک گول۔ ایک نصب العین یا ایک منزل

مقصود ہو۔ اگر کسی ملک کے باشندوں کے سامنے ایک نصب العین نہ ہو تو وہ قوم نہیں بن سکتے۔ یا مختلف لوگوں کے سامنے مختلف نصب العین ہوں تو بھی وہ ایک قوم نہیں بن سکتے۔

دنیا کے مختلف ملکوں کے رہنے والے اپنے سامنے مختلف نصب العین رکھتے ہیں اور اس طرح ایک ملک کے باشندے یک قوم بن جاتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا نصب العین خود ان کے خدا نے مقرر کر دیا ہے۔ اس نے ان سے کہا ہے کہ **وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا** (آل عمران۔ آیت 102)۔ تم سب مل کر۔ اکٹھے ہو کر۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو (یہی تم سب کا نصب العین ہے۔ اس نصب العین کی وحدت سے تم ایک امت بنتے ہو۔ اس لئے تم الگ الگ نصب العین سامنے رکھ کر) مختلف گروہ نہ بن جاؤ۔ یہ "اللہ کی رسی" جس سے مسلمان ایک امت بنتے ہیں اس کی کتاب یعنی قرآن مجید ہے۔ یہی وہ گول ہے جس کی طرف ہر مسلمان کا رخ ہونا چاہئے۔ یہی وہ منزل مقصود ہے جس کی طرف ان سب کا قدم اٹھنا چاہئے اسی وحدت نصب العین کا نام توحید ہے۔ کھیل کے میدان میں جن گیارہ کھلاڑیوں کا گول ایک ہوتا ہے انہیں ایک ٹیم کہا جاتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں دوسرے کھلاڑیوں کا گول ان سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ دوسری ٹیم کہلاتے ہیں۔ آپ نے غور کیا کہ ایک ہی میدان کے کھلاڑی دو گروہ کس طرح بن گئے؟ محض گول کے الگ الگ ہونے سے۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح میں قوم کے نصب العین یا گول کو آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان' آئیڈیالوجی کی وحدت کی بناء پر امت بنتے ہیں۔ ان سب کی آئیڈیالوجی ایک ہوتی ہے جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے اسی کا نام توحید ہے۔ اگر ان کی آئیڈیالوجی مختلف ہو جائے تو اسے شرک کہیں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا ہے کہ **وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝** (سورۃ روم۔ آیت 32)۔ اے مسلمانو! دیکھنا تم کہیں (مومن ہونے کے بعد پھر) مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھے۔ پھر ان میں سے ہر ایک فرقے کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ اپنے طریقہ (کو حق سمجھ کر اس) میں مگن ہو گیا۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کس طرح نصب العین کی وحدت کو توحید اور نصب العین کے اختلاف کو شرک قرار دیا ہے۔ یہ اس لئے کہ مسلمان ایک امت بنتے ہی نصب العین کی وحدت سے ہیں۔ جب مختلف گروہوں کے سامنے نصب العین مختلف ہو گئے تو ایک دوسرے سے الگ الگ ہو گئے۔ یہ ایک امت نہ رہے۔ ان کی وحدت ٹوٹ گئی۔ ان میں توحید کی جگہ شرک آگیا۔ مسلمانوں کا نصب العین قرآن کریم ہے۔ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اسی سے مسلمان ایک امت بنتے ہیں۔ یہی ہماری آئیڈیالوجی ہے۔ اس کی خاطر ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔

آپ کہیں گے کہ اس کے لئے پاکستان حاصل کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ قرآن کریم ہمارے پاس اس وقت بھی موجود تھا۔ جب ہم متحدہ ہندوستان میں رہتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے لیکن اس وقت ہم قرآن کریم پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ قرآن کریم زندگی کا ضابطہ ہے۔ یہ قانون کی کتاب ہے جیسا کہ پہلے خطبہ میں بتایا گیا تھا' اس میں خدا نے مستقل اقدار یا نہ بدلنے والے اصول دیئے ہیں تاکہ ہم ان کے مطابق زندگی بسر کریں۔ لیکن ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر نہیں ہو سکتی جب تک اپنی حکومت نہ ہو۔ ہم نے اسی مقصد کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا کہ ہم اپنی مملکت میں قرآن کریم کی مستقل اقدار کو قانون بنا کر نافذ کر سکیں اور اس طرح اپنی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھال سکیں۔ قرآن کریم نے مومن اور کافر میں فرق ہی یہ بتایا ہے کہ مومن وہ ہیں جو قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ کافر

ہیں : وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (سورۃ المائدہ- آیت 44)۔ جو خدا کی نازل کردہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے- سو وہی لوگ کافر ہیں-

مومن کے معنی ہیں ماننے والا اور کافر کے معنی ہیں نہ ماننے والا- انکار کرنے والا- یعنی جو لوگ قرآن کریم کو نصب العین یا آئیڈیالوجی کے مانتے ہیں اور پھر اسی کے مطابق مملکت قائم کرتے ہیں' وہ مومن ہیں- جو لوگ قرآن کر اپنی زندگی کا نصب العین یا آئیڈیالوجی نہیں مانتے اور اس کے مطابق مملکت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں-

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ

(1) افراد اس وقت تک قوم نہیں بنتے جب تک ان کے سامنے ایک گول' ایک نصب العین یا ایک آئیڈیالوجی نہ ہو-

(2) جو لوگ قرآن کریم کو اپنی زندگی کا نصب العین مانتے ہیں' انہیں مسلمان کہتے ہیں اور وہ اس نصب العین کی وحد سے ایک قوم یا امت بنتے ہیں-

(3) قرآن کریم کو زندگی کا نصب العین رکھنے سے مطلب یہ ہے کہ اس کے مطابق حکومت قائم کی جائے-

(4) ہم نے اسی مقصد کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا اور اس کے لئے اسے حاصل کیا تھا-

لیکن پاکستان حاصل کرنے کے بعد ہم بالکل بھول گئے کہ ہماری آئیڈیالوجی کیا ہے- ہمارا نصب العین کیا ہے- یہ ظاہ ہے کہ جب لوگوں کو اپنا نصب العین ہی یاد نہ رہے تو وہ افراد کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں- ایک قوم کبھی نہیں بنتے- دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ہم پاکستان بننے کے بعد' ایک قوم بنے ہی نہیں- ہم میں اجتماعی زندگی آئی ہی نہیں- ہم ایک ٹیم کی حیثیت سے میدان عمل میں اترے ہی نہیں- ہم میں سے کسی کھلاڑی کو پتہ ہی نہیں کہ اس کا گول کون سا ہے- یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے ایک کھلاڑی کی کک ایک طرف کو لگتی رہی ہے اور دوسرے کی دوسری طرف کو- یہ وجہ ہے کہ ہم زندگی کے میدان میں کوئی بازی نہیں جیت سکے-

لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا- پاکستان کی سرزمین ہمارے پاس ہے- اور اللہ کا شکر ہے کہ بالکل محفوظ شکل میں ہمارے پاس موجود ہے- ہماری آئیڈیالوجی- یعنی قرآن مجید ہمارے پاس موجود ہے اور وہ بھی بالکل محفوظ شکل میں موجود ہے- ضرورت صرف اس کی ہے کہ ہم اسے اپنی حکومت کا نصب العین بنا لیں- اس سے ہم ایک امت بھی بن جائیں گے اور صحیح اسلامی زندگی بھی بسر کر سکیں گے-

---

حکومت تمام امت کی ہوتی ہے

قال اللہ تعالیٰ :

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ.....

(سورۃ آل عمران- آیت 109)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم سب سے اچھی امت (قوم) ہو جسے نوع انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے- تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو- اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو-

ایک نصب العین ہو۔ اسے
میں یہ بتایا گیا تھا کہ افراد' اس وقت قوم بنتے ہیں جب ان سب کے سامنے ایک نصب العین ہو۔ اسے
سے سمجھایا گیا تھا جس میں گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں اور ان سب کے سامنے ایک گول ہوتا ہے۔ ہم نے یہ
ن کھلاڑیوں میں سے کوئی دائیں طرف ہوتا ہے کوئی بائیں طرف۔ کوئی آگے۔ کوئی پیچھے۔ سوال یہ پیدا
یہ ان کھلاڑیوں کی اپنی اپنی مرضی پر موقوف ہوتا ہے کہ جس کا جہاں جی چاہے کھڑا ہو جائے اور جو کچھ جی
رنے لگ جائے؟ ظاہر ہے کہ اس طرح بڑی ہڑبونگ مچ جائے گی۔ کھیل کے میدان میں عجیب بے ہنگم قسم کی
پھیل جائے گی۔ ایک ہی ٹیم کے کھلاڑیوں میں جھگڑے شروع ہو جائیں گے۔ جہاں ایک کھلاڑی کھڑا ہے وہاں
کھلاڑی کھڑا ہونا چاہے۔ وہ اپنی جگہ چھوڑنا نہ چاہے۔ یہ اس کی جگہ لینا چاہے۔ دونوں میں دھینگا مشتی شروع ہو
بجائے اس کے کہ یہ دوسری ٹیم کا مقابلہ کریں' خود آپس میں ہی الجھتے رہیں۔ ایسی صورت سے بچنے کے لئے یہ
کھلاڑی اپنے میں سے سب سے اچھے کھلاڑی کو اپنا کپتان چن لیتے ہیں اور یہ عہد کر لیتے ہیں کہ وہ سب اس کپتان کی بات
یں گے۔ اس بات کا فیصلہ کپتان کرتا ہے کہ کون کھلاڑی کس جگہ کھڑا ہو۔ کس کے ذمے کس قسم کا کام لگایا جائے۔ یہی
ن سب کی ڈیوٹیاں لگاتا ہے' یہی ان کے جھگڑوں کے فیصلے کرتا ہے۔ اس طرح یہ کھلاڑی ایک ٹیم بنتے ہیں۔

جو صورت کھلاڑیوں کی ہے وہی ایک قوم یا امت کی ہے۔ امت کے افراد کبھی امت کی شکل میں نہیں رہ سکتے اگر
ان کا کوئی کپتان نہ ہو۔ امت کے افراد اپنے میں سے بہترین فرد کو چن کر اپنا بڑا مان لیتے ہیں اور سب اس کی ہدایات کے
مطابق چلتے ہیں۔ اس سے ان میں باہمی نظم اور ضبط قائم رہتا ہے۔ اس سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے
اہل بنتے اور اپنی منزل مقصود تک پہنچتے ہیں۔ قوم کے اس بڑے فرد کو آج کل کی اصطلاح میں صدر مملکت یا (Head
of The State) کہتے ہیں۔ یعنی مملکت کا سربراہ۔ ہماری اصطلاح میں اسے خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین کہا جاتا ہے۔
سوال اصطلاح کا نہیں حقیقت کا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ وہ امت کا بہترین فرد۔ امت کا چنا ہوا۔ امت کی ٹیم کا کپتان
ہوتا ہے۔

ٹیم اور اس کے کپتان۔ یا قوم اور مملکت کے سربراہ کا معاملہ عجیب ہوتا ہے۔ ٹیم کا کپتان' ٹیم سے باہر کھڑا ہو کر حکم
نہیں چلاتا۔ وہ گیارہ کھلاڑیوں میں سے ایک کھلاڑی ہوتا ہے۔ وہ انہی کی طرح ٹیم کے اندر۔ ٹیم کے ساتھ مل کر کھیلتا
ہے۔ وہ جب ڈیوٹیاں تقسیم کرتا ہے تو اپنے ذمے بھی ایک ڈیوٹی لیتا ہے۔ وہ اس ڈیوٹی کو ایک عام کھلاڑی کی طرح
سرانجام دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ساری ٹیم کو مناسب ہدایات بھی دیتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ٹیم کے
کپتان کو دہرے فرائض سرانجام دینے پڑتے ہیں۔ یہی حالت امت کے سربراہ کی ہے۔ وہ امت کا ایک فرد۔ یا یوں سمجھئے
مملکت پاکستان کا ایک عام شہری ہوتا ہے اور اس کے ذمے وہ تمام فرائض ہوتے ہیں جو دوسرے شہریوں کے ذمے
تے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اس کے ذمے یہ کام بھی ہوتا ہے کہ وہ ساری قوم کی سربراہی کرے۔ انہیں مناسب
ہدایت دے اور اس کا اطمینان کرے کہ ہر فرد اپنا اپنا فریضہ صحیح طور پر ادا کر رہا ہے۔ اس لئے اسے باقیوں کے مقابلہ
میں کئی گنا زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔

لیکن کپتان مقرر کر لینے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ باقی کھلاڑی اطمینان سے بیٹھ جائیں اور سمجھ لیں کہ سارا کام کپتان
ہی کرے گا۔ وہی گول کرے گا اور وہی اکیلا مقابل کی ٹیم کو شکست دیدے گا۔ بالکل نہیں۔ جب تک ٹیم کا ہر ایک
کھلاڑی اپنی اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر سرانجام نہیں دے گا' ٹیم کبھی جیت نہیں سکے گی اور کوئی کھلاڑی اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر

سرانجام نہیں دے سکتا جب تک وہ کپتان کی ہدایات کی اطاعت نہ کرے۔ لہٰذا

(1) ٹیم کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے میں سے بہترین فرد کو اپنا کپتان چنے۔

(2) کپتان کا کام یہ ہے کہ وہ ٹیم کو بہترین ہدایات دے۔ اور

(3) ٹیم کے ہر کھلاڑی کا کام یہ ہے کہ وہ کپتان کی ہدایت کے مطابق اپنا فریضہ سرانجام دینے میں پوری پوری کوشش کرے۔

جو ٹیم اس طرح کرے گی وہ کامیاب ہو جائے گی۔ پھر یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ ٹیم کی جیت' کپتان کی جیت اور ٹیم کی ہار کپتان کی ہار نہیں کہلاتی۔ جیتتی بھی ٹیم ہے اور ہارتی بھی ٹیم ہے۔ یہی حالت قوم کی ہے۔ اگر کوئی قوم اپنا سربراہ اچھا نہیں چنتی۔ اگر وہ سربراہ صحیح ہدایات نہیں دیتا۔ اگر قوم کے افراد اپنے سربراہ کی ہدایات کی اطاعت نہیں کرتے تو زندگی کے میدان میں اس قوم کو مخالف اقوام کے مقابلہ میں شکست ہو جاتی ہے۔ یہ شکست ساری قوم کی ہوتی ہے۔ جس طرح جیت ساری قوم کی جیت ہوتی ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ قوم کا سربراہ جو فیصلے کرتا ہے وہ اس کے ذاتی فیصلے نہیں ہوتے بلکہ ساری قوم پر ان کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ ساری قوم کے فیصلے ہوتے ہیں۔ قوم کا سربراہ جو معاہدات دوسری اقوام سے کرتا ہے وہ بھی اس کے ذاتی معاہدات نہیں ہوتے' ان کی ذمہ داری پوری قوم پر عائد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ **وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** (سورۃ الشوریٰ۔ آیت 38)۔ ان کی حکومت باہمی مشورہ سے ہوتی ہے اور اسی لئے' جیسا کہ اس آیت میں کہا گیا ہے جو شروع میں تلاوت کی گئی ہے' قرآن کریم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی بھلائیوں کے حکم دینے اور برائیوں سے روکنے) کا فریضہ' ساری امت کا قرار دیا ہے۔ صرف امت کے سربراہ کا فریضہ قرار نہیں دیا۔ گویا ایک اسلامی حکومت کی طرف سے جس قدر احکامات نافذ ہوتے ہیں' وہ ساری امت کی طرف سے نافذ شدہ احکام سمجھے جاتے ہیں۔ وہ حکومت ساری امت کی ہوتی ہے۔ کسی خاص گروہ یا خاص فرد کی حکومت نہیں ہوتی۔

اس ضمن میں ایک اہم بات اور بھی قابل غور ہے۔ کیا ٹیم کے کپتان کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کا حکم جی میں آئے دے دے یا اس پر بھی کوئی پابندی عائد ہوتی ہے؟ اس بات کے سمجھنے کے لئے آپ فٹ بال کے کھیل کو پھر سے سامنے لایئے۔ اس میں ایک قاعدہ یہ ہے کہ بال کو ہاتھ نہ لگنے پائے۔ اگر کسی کھلاڑی کا بال کو ہاتھ لگ گیا تو وہ مجرم سمجھا جائے گا۔ ٹیم کے کپتان کو اس کا حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ کسی کھلاڑی سے یہ کہہ دے کہ تم بال کو ہاتھ سے بھی چھو سکتے ہو۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کپتان کے اختیارات ان قاعدوں کے ماتحت ہوتے ہیں جو کھیل کے لئے بطور اصول اختیار کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے خطبہ میں بتایا گیا تھا' اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایسی مستقل اقدار یا اصول دیئے ہیں جن میں کبھی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ اسلامی مملکت ان مستقل اقدار یا نہ بدلنے والے اصولوں کو عملاً نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لئے اسلامی مملکت کے سربراہ کو اس کا حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ ان اصولوں میں کسی قسم کا رد و بدل کر سکے یا ان کے خلاف کوئی حکم نافذ کر سکے۔ **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (سورۃ انعام۔ آیت 34)۔ خدا کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ اس لئے حکومت کا سربراہ یا کوئی اور' نہ تو ان مستقل اصولوں میں کوئی رد و بدل کر سکتا ہے اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی حکم دے سکتا ہے۔ یہ زندگی کے میدان کے اٹل قانون ہیں۔ ان کی

پابندی ہر حال میں ضروری ہوتی ہے۔

ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے' فٹ بال کے کھیل کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ بال کو کسی کا ہاتھ نہیں لگنا چاہئے۔ اس قاعدے سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہوتا۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ کھلاڑیوں کو تو اس کی اجازت نہ ہو کہ وہ بال کو ہاتھ لگا سکیں لیکن کپتان کا جی چاہے تو بال کو پاؤں سے کک لگا دے اور جی چاہے تو ہاتھ سے پکڑ لے۔ بالکل نہیں۔ قاعدے کی پابندی ہر ایک کو یکساں طور پر کرنی ہوتی ہے۔ یہی صورت اسلامی حکومت کی ہے۔ اس میں خدا کے مقرر کردہ اصول ہر ایک پر یکساں طور پر نافذ ہوتے ہیں۔ مملکت کی بڑی سے بڑی ہستی بھی ان اصولوں سے بالا نہیں ہوتی اور تو اور' خود حضور نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے کہلوا دیا گیا کہ : **اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ**O(سورۃ انعام۔ آیت 164)_ میں ان میں سب سے پہلا ہوں جو قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے ہیں"۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں' مملکت کے سربراہ کو باقی افراد امت کے مقابلہ میں کوئی خصوصیت یا رعایت حاصل نہیں۔ وہ خدا کے مقرر کئے ہوئے اصولوں میں رد و بدل نہیں کر سکتا۔ وہ ان کے خلاف کوئی حکم صادر نہیں کر سکتا۔ اسے سب سے پہلے ان قوانین کی اطاعت کرنی ہوتی ہے۔ وہ اگر ان کی خلاف ورزی کرے تو اس سے بھی اسی قسم کا مواخذہ ہو گا جس قسم کا مواخذہ قوم کے ایک عام فرد سے ہو گا۔ اور اسے بھی اسی قسم کی سزا ملے گی۔ چنانچہ خود حضور رسالت مآب (ﷺ) کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ **قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ**O (سورۃ انعام۔ آیت 15)_ ان سے کہہ دو کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن (یعنی مکافات عمل کے وقت) سے ڈرتا ہوں۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں :

(1) افراد امت اپنے میں سے بہترین فرد کو اپنا سربراہ چن لیتے ہیں۔

(2) وہ سربراہ مملکت کے تمام اختلافی معاملات طے کرتا ہے۔

(3) افراد امت پر اس کے فیصلوں کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔

(4) لیکن وہ اپنے فیصلوں میں ڈکٹیٹر نہیں ہوتا۔ اسے ان اصولوں کی پابندی کرنی ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں۔

(5) اس بارے میں اس میں اور ایک عام فرد امت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو اسلامی حکومت کسی فرد یا کسی گروہ کی حکومت نہیں ہوتی۔ وہ ساری کی ساری قوم (یا امت) کی حکومت ہوتی ہے اور اس میں تمام فیصلے احکام اور قوانین' خدا کے مقرر کردہ اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے مرتب ہوتے ہیں۔ ان کی خلاف ورزی کوئی نہیں کر سکتا۔ اس طرز حکومت کا اثر دنیا کے دوسرے انسانوں پر کیا پڑتا ہے اور یہ حکومت باقی حکومتوں کے مقابلہ میں سب سے اچھی کیوں ہوتی ہے۔ اس کی بابت کبھی پھر بتایا جائے گا۔ والسلام

پرویزؒ صاحب سے ایک سوال

محترم محمد عبداللہ صاحب شاہ پور صدر سے پرویز صاحب سے دریافت کرتے ہیں کہ

''آپ چونکہ حدیث شریف کے قائل نہیں ہیں محض قرآن کو ''حسبنا کتاب اللہ'' کہہ کر قابل عمل و کافی سمجھتے ہیں اور قرآن مجید میں بار بار ''اقیموا الصلوٰۃ'' ہے، آپ مجھے ازروئے قرآن ترکیب نماز سے مطلع فرمائیں۔ حدیث و رجال و طریق امت سے بالاتر رہ کر قرآن مجید سے دلیل نقلی پیش فرمائیں۔ اور آپ بھی سنا ہے بہت نیک اور نمازی ہیں، آپ کیسے نماز پڑھتے ہیں اور کیوں اس طرح پڑھتے ہیں؟''

طلوع اسلام :-

(۱) آپ کی یہ اطلاع درست نہیں کہ میں حدیث کا قائل نہیں۔ میں قرآن اور حدیث دونوں کو ان کے اپنے اپنے مقام پر مانتا ہوں۔

(۲) آپ کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ میں دین کی جزئیات تک کے لئے بھی قرآن کو کافی سمجھتا ہوں۔ قرآن کریم بالعموم دین کے اصول عطا کرتا ہے جو ہر طرح سے مکمل اور ناقابل تغیر و تبدل اور حک و اضافہ ہیں۔ یہی مفہوم ''حسبنا کتاب اللہ'' کا ہے۔ لہٰذا نماز کی جزئیات اور ترکیب تمام و کمال قرآن کے اندر نہیں۔ انہیں رسولؐ نے مرتب فرمایا تھا۔ بعد میں ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

(۳) میں اس طرح نماز پڑھتا ہوں۔ جس طرح جمہور مسلمان پڑھتے ہیں۔ اس میں نہ میں اور نہ کوئی اور فرد کسی قسم کے ردوبدل کا مجاز ہے۔

(پرویز، طلوع اسلام، ۷ مئی ۱۹۵۵ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شورش کاشمیری (مرحوم)

شاہکار رسالتؐ

(ایک معرکہ آرا تصنیف)

(عجمی تخیلات ________ علامہ اقبالؒ اور غلام احمد پرویز)

علامہ اقبالؒ نے تشکیل جدید الہیات کے پانچویں خطبہ میں فرمایا تھا'

"اگر قوم کے زوال و انحطاط کو روکنا ہے تو اس کا یہ طریق نہیں کہ ہم گذشتہ تاریخ کو بے جا احترام کی نظر سے دیکھنے لگیں یا اس کا احیا خود ساختہ ذرائع سے کریں"۔

چودھری محمد احسن کے نام حضرت علامہؒ نے ایک خط میں لکھا (ملاحظہ ہو اقبال نامہ) کہ

"میرے نزدیک مہدیت و مسیحیت کے متعلق جو احادیث ہیں وہ ایرانی و عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ ان کا عربی تخیلات اور قرآن کی صحیح سپرٹ سے کوئی سروکار نہیں"۔

ایک دوسرے خط میں جو مولوی سراج دین کے نام ہے علامہؒ فرماتے ہیں:

"ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں ان کو عربی اسلام' اس کے نصب العین اور اس کی غرض و غایت سے آشنائی نہیں"۔

انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار (صفحہ 193-192)

ڈاکٹر سید یامین ہاشمی کے نام علامہؒ کا ایک خط ہے' فرماتے ہیں:

"میری رائے میں عجمیت ایشیاء کے مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوئی ہے۔ اس باطل کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ عجمیت کا اثر مذہب' لٹریچر اور عام زندگی پر غالب ہے"۔

محمد دین فوق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"عربی اسلام ہندوستان میں ایک فراموش شدہ چیز ہے"۔

(انوار اقبالؒ صفحہ 66)

ارمغان حجاز کا وہ مصرع۔ ع

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ

اقبال کے اس شدید تاریخی احساس ہی کا نتیجہ تھا۔

محولہ بالا اشارات (اقتباسات) کا اقتضاء تھا کہ دانشوران اقبال اس موضوع پر قلم اٹھاتے اور اسلامیات کی تاریخ میں عجمی اثرات کا جائزہ لیتے لیکن کسی اقبالی نے اس پر غور نہیں کیا' نہ اس طرف توجہ کی اور نہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے راستہ کی اس سب سے بڑی روک کو دور کیا۔۔ اغلب خیال ہے کہ وہ اس کے اہل ہی نہ تھے اور ایک دوسرا خیال یہ بھی ہے کہ ان کی روپہلی اور طلائی مصلحتوں میں اس کا حوصلہ ہی نہ تھا۔

دو روز پہلے مولانا تاج محمود (لائل پور) کی معیت میں ایک فاضل دوست سے ملاقات ہوئی تو وہاں دوران گفتگو اسلامیات میں عجمی اثرات کا ذکر آگیا۔ اس دوست نے جناب غلام احمد پرویز کی تازہ کتاب "شاہکار رسالتؐ (عمر فاروقؓ) کا ذکر کیا کہ اس کا مطالعہ ہر علم دوست کا فرض ہے۔ اقبالؒ نے جس عجمی سازش کو خطوط و خطبات میں اشارۃً" بیان کیا۔ شاہکار رسالتؐ اس کا تفصیلی مرقع ہے۔ بڑے سائز کے 528 صفحات کی اس کتاب میں چودھواں باب بہ عنوان (شعلہ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد) کے تقریباً" سو صفحات عجمی سازش کی تفصیلات سے متعلق کئی ہزار تاریخی صفحات کا نچوڑ ہیں۔ اس جامع باب کو ایک جامع کتاب کی خصوصیت حاصل ہے۔ ہر ضمنی عنوان کے

تحت اس کی تفصیل موجود ہے۔ کوئی سی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ اگر کوئی سوال ذہن میں ابھرتا ہے تو اس کا جواب انہی مباحث میں نکل آتا ہے۔ حتیٰ کہ مطالعاتی طبیعت بھی کوئی نہ کوئی نیا نکتہ حاصل کر پاتی ہے۔

جہاں تک پوری کتاب کا تعلق ہے' راقم نے ابھی تک اس کا مطالعہ نہیں کیا۔ صرف چودھواں باب ہی بالاستیعاب پڑھا ہے۔ ظاہر ہے کامل مطالعہ کے بعد ہی پوری کتاب پر نقد و نظر کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ لیکن چودھویں باب کے مطالعہ سے فارغ ہو کر راقم نے محسوس کیا کہ :

(1) پرویز نے عجم سے متعلق اقبالؒ کی ذہنی تگ و دو کو اپنے قلم کی معرفت' حقائق و معارف کے تاریخی سانچہ میں ڈھالا اور اندھیروں کو اجالوں سے متعارف کیا ہے۔

(2) کتاب کے متعلق جیسا کہ عرض کیا قبل از مطالعہ رائے دینا مشکل ہے۔ انشاء اللہ یہ فرض بھی جلد ادا ہو گا۔ لیکن چودھواں باب تاریخ اسلام کے سیاسی و علمی مصائب کی ایک تجزیاتی کہانی اور فی الجملہ عجم کے ہاتھوں اسلام پر کیا گزری کی' روداد ہے۔

(3) ہو سکتا ہے کسی دائرے میں یا کسی پہلو سے بعض اکابر علماء اور محقق فضلاء کو اساسی یا جزوی اختلاف ہو لیکن راقم نے پرویز سے متعلق اپنے مستعار نظریے میں' جو علمائے کرام کے فتوے کی بدولت ذہن پر نقش تھا' ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کی۔ فی الجملہ پرویز اپنی سیاسی شدتوں اور شخصی عصبیتوں کے باوجود اسلام کے تاریخی ذہن سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ پر سوچتے ہیں۔ ان کے دل میں سرگزشت اسلام کی ویرانیوں پر شدید ہلچل ہے۔ اور وہ مسلمانوں کی نئی پود کے ذہنی اضطراب کو دور کرنے کے لئے عصری افکار کے لہجہ میں اسلام کی اساس پر ان سے ہمکلام ہوتے ہیں۔

(4) محولہ باب کے مباحث ذیل کے عنوانوں پر ہیں۔ مثلاً۔

مسلمانوں کی طاقت کا راز کیا تھا؟ مسلمانوں سے قرآن چھڑا دینے کی باطنی تحریک کا آغاز اور اس کے نتائج۔ ایران و روما کی فتوحات اور ان کا فرق۔ یزدگرد کے دستہ خاص کا قبول اسلام۔ فتح قادسیہ کے بعد ایرانی ردعمل' کوفہ و بصرہ میں ایرانیوں کی آبادکاری۔ عجمی سازش کے دو نمایاں محاذ۔ روایات کا عل خانہ۔ مسئلہ خلافت' حق وراثت کے سیاسی مضمرات' اہل ای کا اپنے شہنشاہوں سے متعلق عقیدہ' عبداللہ بن سباء۔ رجعت کا عقیدہ۔ امامت کا منصوص تصور۔ کفر و ایمان کا خط امتیاز۔ مستند شیعی روایات۔ حضرت سلمان فارسیؓ۔ بنی امیہ اور بنو عباس کی رقابتیں۔ سادات و علوی۔ ابو مسلم خراسانی۔ برامکہ۔ فاطمیین مصر۔ دیلمی حکومت۔ بغداد کا شیعی دور۔ عباسی سلطنت کا خاتمہ۔ ایرانیوں نے کتنی مدت بعد جنگ قادسیہ کا انتقام لیا۔ اسلام کی اساسات۔ مختلف فرقے۔ اور ان کے ساختہ پرداختہ نظریے۔ محرف قرآن۔ باطنی معانی۔ محدث کا عقیدہ۔ کاشانہ نبوت پر ذہنی آتشبازی۔ جامعین حدیث سینوں کے عقائد پر عجمی اثرات۔ جمع قرآن سے متعلق شکوک و شبہات۔ ناسخ و منسوخ کا عقیدہ۔ حدیث کا مقام۔ ابن جریر طبری کون تھے؟ طبری کی تاریخ۔ اسلام دین نہ رہا مذہب ہو گیا۔ آیہ استخلاف کا مفہوم بدل گیا۔ مذہب و سیاست میں ثنویت۔ قانون سازی کے امکان کا خاتمہ۔ نظام سرمایہ داری کا احیاء۔ تقدیر کا عقیدہ۔ تقدیر سے متعلق روایات۔ تصوف کی حقیقت۔ ابن عربی۔ اساسات تصوف۔ باطنی علم کی سند۔ جہاد کے خلاف عجمی یلغار (افکار اقبال کی روشنی میں) میرزا غلام احمد کا دعویٰ ایرانی سازش کا مخلص اور ان عوارض و امراض کا علاج جو مسلمانوں کے وجود کو اجتماعی طور پر لاحق ہو چکے ہیں۔

(5) پرویز صاحب سے متعلق دینی حلقوں میں تسلسل و تواتر سے یہ فضا قائم رہی ہے کہ وہ منکر حدیث ہیں۔ لیکن انہوں نے جن شگفتہ الفاظ میں اپنے عقیدہ کی صراحت کی ہے اس کے بعد معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔

راقم استفساراً" علماء سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ حضرت امام بخاریؒ نے چھ لاکھ احادیث جمع کیں اور کانٹ چھانٹ کے بعد صرف 2762 باقی رکھیں۔ امام مسلمؒ نے تین لاکھ مدون کیں اور باقی 4348 رہنے دیں۔ امام ترمذیؒ نے تین لاکھ اکٹھا کیں اور 2115 کو مرتب کیا۔ امام ابو داؤدؒ نے پانچ لاکھ فراہم کیں اور 4800 کو احاطہ تحریر میں لائے۔ ابن ماجہؒ نے چار لاکھ کا ذخیرہ کیا اور کتاب میں چار ہزار نقل کیں۔ امام نسائیؒ نے دو لاکھ کے خزانہ میں 4321 کو اپنے مجموعہ میں درج

کیا۔ لیکن پرویز کی چھتاڑ اس الزام میں کرنا کہ وہ احادیث کو تسلیم نہیں کرتے اس کی بنیاد کیا ہے؟ پرویز ان احادیث کو واقعی تسلیم نہیں کرتے جو قرآن پاک کی تعلیمات کے خلاف ہیں اور جنہیں سرور کائنات ﷺ کے ارشادات سے کوئی سی نسبت ہی نہیں۔ ایسی احادیث خلافت راشدہ کے بعد بعض ملوکانہ مصلحتوں کے تحت وضع کی گئیں یا عجمی سازش نے اپنے سانچوں میں ڈھال کے انہیں رسول اللہ ﷺ سے منسوب کیا۔ ایک مبحث یا مسئلے کو' جو تاریخ اسلام کا عصری مضمون ہے اور نئی پود کے دماغ اس سے دو چار ہیں' واقعہ یہ ہے کہ ہمارے مقتدر علما۔ اپنی یلغار سے اس کو ٹال نہیں سکتے۔ اور نہ یہ مسئلہ یا مبحث کفر و اسلام سے متعلق ہے۔ نئی پود کی سوچ لیا ہے؟ پرویز نے اسی کی نمائندگی کی اور اپنی ذہنی جدوجہد سے اسلام کے دامن سے عجمی گرد جھاڑی ہے۔ بعض طبیعتوں کو شاید یہ گوارا نہیں لیکن علم کو غصہ سے روکنا کسی حالت میں بھی جائز نہیں۔

(6) پرویز صاحب نے اسی باب میں اپنے عقیدے کی وضاحت کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"میں نہ سنی ہوں نہ شیعہ۔ میرا تعلق کسی بھی فرقہ سے نہیں۔ قرآن کریم کا طالب علم ہوں۔ اور میرا عقیدہ بلکہ ایمان یہ ہے کہ خدا کی یہ کتاب عظیم دین میں سند و حجت ہے اور حق و باطل کے پرکھنے کا واحد معیار۔ کوئی عقیدہ' نظریہ' تصور' مشرب' جو اس کے خلاف جاتا ہو میرے نزدیک درست نہیں خواہ اس کی نسبت کسی طرف بھی کیوں نہ کی گئی ہو۔ اگر کسی قسم کا کوئی عقیدہ بزرگان سلف میں سے کسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے خواہ ان کا تعلق کسی فرقے سے ہو تو ان حضرات کے احترام کے پیش نظر میں یہی کہتا ہوں کہ ان کی طرف اس کی نسبت صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ انہوں نے ایسا نہیں کہا ہو گا"۔ (صفحہ 499)

اس وضاحت کے بعد پرویز کی شرعی چھتاڑ لائق اعتنا نہیں ایک مسلمان کے لئے قرآن کے مقابلہ میں کسی بڑی شخصیت کا مختلف المعنی قول حجت نہیں بلکہ اس سے اجتناب مسلمان کا فرض ہے۔

شاہکار رسالت مضمون و موضوع کی عمدگی کے علاوہ کتابت و طباعت کے اعتبار سے بھی ایک اعلیٰ کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ نظر و فکر کی بہت سی راہیں کشادہ کرتا اور اسلام کے مثالی نظام ریاست کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں کہ عمر بھر وہ اس کی آرزو کرتے رہے' اس کتاب کو مسلمانوں کی ذہنی سوانح عمری کہا جائے تو صحیح ہو گا۔

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف میں

پرویز صاحب سے ہمیں خود کئی دوائر میں اختلاف ہے لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے ہمارے ذہن میں ان کے لئے احترام کی ایک خاص فضا پیدا ہو گئی ہے۔ اقبال عجم کے متعلق جو چاہتے تھے' شاہکار رسالت ان کی اسی خواہش کا علمی مرقع اور تاریخی شہ پارہ ہے۔

پرویز کے خلاف فتوے واپس لیجئے

ایڈیٹر چٹان کو آج تک جناب غلام احمد پرویز سے ذاتی نیاز حاصل نہیں ہو سکا۔ کبھی ان سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن ان کی عظیم کتاب شاہکار رسالتؐ پڑھنے کے بعد ایڈیٹر چٹان کو یقین ہو چکا ہے کہ اپنی اس کتاب کی بدولت پرویز بارگاہ رسالتؐ میں سرخرو ہو کر باریاب ہوں گے اور یہ کتاب ان کے لئے توشہ آخرت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ان فضلاء کے ساتھ انہیں جگہ دیں گے جن کے دل اسلام کے لئے ہر دور میں دھڑکتے رہے ہیں۔

غلطیاں ہر انسان سے ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے صلحائے امت کے نزدیک کسی مقام پر ان کے قلم کو ٹھوکر لگی ہو۔ آخر وہ ایک انسان ہیں۔ لیکن ان کے سچا مسلمان ہونے میں کوئی شک نہیں۔ وہ قرآنی فکر کی ایک فاضل شخصیت ہیں۔ علماء سے [illegible] شاہکار رسالت کا مطالعہ کریں اور ضرور کریں۔

ان کی بلند فکر کے نزدیک پرویز صاحب سے کبھی تفقہ فی الدین میں کوئی چوک ہوئی ہے تو انہیں محبت سے مطلع کریں تاکہ ایک سچا دل اپنی "کوتاہی" کا جائزہ لے سکے۔۔ حقیقت یہ ہے کہ پرویز بھی افکار اسلام کی کربلا میں حسینی قافلہ کی ایک آواز ہیں۔ علماء کو ان سے متعلق اپنا فتویٰ واپس لینا چاہئے۔

(چٹان' مورخہ 74-5-13)

اِسلام — مذہب نہیں

دِین ہے۔ یعنی نظامِ حیات جو ایک آزاد مملکت میں پروان چڑھتا ہے۔
اس نظام کی تشکیل کا آغاز عہدِ نبویؐ میں ہوا لیکن وہ اپنے عہدِ شباب تک

خلافتِ فاروقیؓ

میں پہنچا۔ اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ حیات دیکھنے کے لیے اُس عہد کی صحیح تصویر کا سامنے آنا ضروری ہے۔ اسے پرویز صاحب نے اپنی مدّت العمر کی تحقیق و کاوش کے بعد اپنی

عظیم تصنیف

شاہکارِ رسالتؐ

میں پیش کیا ہے۔ اس کے آخری باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ

عہدِ فاروقیؓ کے بعد اسلام پر کیا گزری؟

اور وہ کس طرح دین سے موجودہ مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اس کتاب نے ہماری فکری دُنیا میں

انقلاب پیدا کر دیا ہے

بڑی ضخیم کتاب ہے

اعلیٰ ایڈیشن Rs. 400/=

سٹوڈنٹ ایڈیشن Rs. 200/=

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بشیر احمد عابد، کویت

اگلا قدم

طلوع اسلام کی جدوجہد کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ اس کا اجراء اکتوبر 1935ء میں علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے ایماء پر سید نذیر نیازی کی زیر ادارت ہوا تھا۔ لیکن بعض نامساعد حالات کی بناء پر اس کی اشاعت بند کر دی گئی۔ اس کا دوبارہ اجراء مئی 1938ء میں ہوا اور تب سے لیکر اب تک یہ مجلّہ بلا تعطل شائع ہوتا چلا آرہا ہے۔ طلوع اسلام کیلئے جو اغراض و مقاصد متعین کئے گئے تھے ان میں سے سرفہرست نظریہ پاکستان کی ترجمانی تھی۔ برصغیر کی آزادی کے دوران جب نظریہ پاکستان پیش کیا گیا تو اس کی چاروں طرف سے مخالفت ہوئی حتیٰ کہ خود مسلمانوں کے ایک مخصوص گروہ نے بھی اس کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس مخالفت کا سدباب کرنے اور نظریہ پاکستان کو اس کے حقیقی تناظر میں پیش کرنے کیلئے ایک مجلّے کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی۔ چنانچہ اس سلسلے میں چند صاحب ہمت اور درد مند مسلمانوں نے مل کر مجلّہ طلوع اسلام کو از سر نو شائع کرنے کا اہتمام کیا۔

نظریہ پاکستان کی بنیاد اس اصول پر مبنی تھی کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور اسلام مذہب نہیں بلکہ ایک نظام مملکت ہے جسے نافذ العمل کرنے کیلئے آزاد سرزمین کی ضرورت ہے۔ اسلام کو مذہب سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ غلط نگہی کا نتیجہ ہے۔ مذہب انسان اور خدا کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہے۔ اس کا اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جبکہ اسلام کا نظام حیات انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے اور آزاد وطن کی عدم موجودگی میں اسلام کے آفاقی اصولوں پر عمل پیرا ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ ان اصول و اقدار کو نافذ کرنے کیلئے ایک مخلص اور فرض شناس قیادت کی ضرورت ہے۔ جو ان قوانین کو ان کی روح کے مطابق نافذ کرے تاکہ ان سے کماحقہ، فوائد حاصل کئے جا سکیں۔ چونکہ اسلام کے سیاسی و اقتصادی اصول و اقدار کسی بھی نظام سے مماثلت نہیں رکھتے اس لئے کسی بھی غیر مسلم قوم کے ساتھ مل کر انہیں نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ ان اصول و اقدار کا نفاذ صرف اس قوم کے ہاتھوں روبہ عمل آتا ہے جو ان کی صداقت پر اٹل ایمان رکھے۔ لہٰذا الگ وطن کا حصول مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی ضرورت ہے بلکہ ان کے ایمان کا تقاضا بھی ہے۔ اس طرح وہ اپنا مخصوص اور منفرد سیاسی و اقتصادی نظام تشکیل دے کر اقوام عالم پر اپنی برتری اور فضیلت ثابت کر سکیں گے۔ خدا کا وعدہ ہے کہ جو قوم بھی اس کے قوانین کے مطابق حکمرانی قائم کرے گی اسے دنیا میں فضیلت اور عروج حاصل ہو گا۔ **كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا**○ اور خدا کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ کیونکہ اس نے اس کی ذمہ داری قبول کر رکھی ہے۔ اقوام سابقہ میں سے جنہوں نے بھی اپنا نظام حکومت، وحی خداوندی کی روشنی میں منشکل کیا، انہیں دنیا میں ممتاز مقام حاصل ہوا۔ بنی اسرائیل کا ذکر قرآن میں بار بار آتا ہے اور اس حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے کہ ان پر یہ احسان خداوندی ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ**○ اور ہم نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر فضیلت عطا کر دی۔ (2:122) اسلام کا نظام مملکت تمام نوع انسان کیلئے

موجب رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام نوع انسان کو مخاطب کیا ہے۔ يَاَيُّهَا النَّاسُ اے نوع انسان! قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسا ضابطہ تمہارے پاس آگیا ہے جس میں ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے دل کو وقف اضطراب رکھتی ہے۔ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ اور جو قوم اسے اپنا ضابطہ حیات تسلیم کرلیتی ہے اسے ترقی و خوشحالی سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ ان سے کہو! کہ اس قسم کے ضابطہ حیات کا مل جانا خدا کے فضل و رحمت سے ہے۔ تم کسی قیمت پر بھی اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ وَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا لہذا تمہیں چاہئے کہ اس کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۝ یہ زندگی کی ہر متاع سے زیادہ گراں بہا اور عزیز تر ہے۔ (10:57-58)

خدا کے قوانین مسلمان قوم کے پاس امانت ہیں۔ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی نگاہ اس حقیقت پر تھی کہ آزاد وطن کی صورت میں مسلمان اس امانت کی صحیح طور پر حفاظت کر سکیں گے۔ اس لئے وہ حصول پاکستان کو انتہائی ضروری سمجھتے تھے۔ حصول پاکستان کی جدوجہد کا تمام تر دارومدار نظریہ پاکستان کی مقبولیت پر تھا۔ چنانچہ طلوع اسلام کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ اس نظریہ کے حق میں رائے عامہ ہموار کرے۔ الحمدللہ۔ طلوع اسلام نے اپنی ذمہ داریوں کو احسن طور پر نبھایا۔ نظریہ پاکستان کے خلاف جو طوفان اٹھا تھا اس کا نہایت ہمت و استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا اور مخالفین کی ہر دلیل کا مثبت اور موزوں جواب دیا۔ طلوع اسلام کی یہ جدوجہد تاریخ پاکستان کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ طلوع اسلام کے اس دور کے فائل آج بھی مورخین و محققین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ تحریک پاکستان کے بارے میں صحیح حقائق معلوم کرنے ہوں، یعنی کہ کس نے کیا کردار ادا کیا اور قوم کن مشکل مراحل سے گزر کر آزادی کی نعمت سے بہرہ یاب ہوئی تو اس ضمن میں پرویز میموریل لائبریری (لاہور) کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

طلوع اسلام کو اپنی جدوجہد پر بجا طور پر فخر ہے۔ اس نے نظریہ پاکستان کو عوام کے قلوب و اذہان میں اس قدر راسخ کر دیا تھا کہ مخالفین کی ہزار کوششوں کے باوجود عوام نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ قیام پاکستان کے بعد طلوع اسلام کی اشاعت یہاں سے شروع ہو گئی۔ اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں تاکہ پاکستان کا حقیقی نصب العین عوام کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ قیام پاکستان کے بعد اسلام کا سیاسی و اقتصادی نظام اصولاً نافذ کر دینا چاہئے تھا۔ اس نظام کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہ تھی۔ کیونکہ جن لوگوں نے تحریک پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لیا تھا ان پر پاکستان کا نصب العین روز روشن کی طرح عیاں تھا۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ لیکن بدبختی سے ایک تو قائداعظمؒ ہم میں نہ رہے اور دوسرے حصول اقتدار کی ایسی مذموم کشمکش شروع ہو گئی جو آج تک ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ پاکستان کا اصل نصب العین پس پشت ڈال دیا گیا اور ارباب اقتدار و اختیار اپنے اپنے مفادات کے پیچھے پڑ گئے۔ نتیجتاً قوم ذلت و مسکنت اور غربت و افلاس کی دلدل میں دھنستی چلی گئی۔

طلوع اسلام اپنے محدود ذرائع کے مطابق قوم کو اس دلدل سے باہر نکالنے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو پاکستان کے حقیقی نصب العین کے ساتھ پہلے کی طرح متمسک کر رکھا ہے۔ اس کی پالیسی ذرہ بھر تبدیل نہیں ہوئی۔ یہ اب بھی سمجھتا ہے کہ مسلمان قوم کی کامیابی و کامرانی کا راز اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام میں ہے۔ معاشرے سے ظلم و استحصال کو ختم کرنے کیلئے لازمی ہے کہ قرآن کریم کے اصول و اقدار نافذ کئے جائیں۔ امیر و غریب کے درمیان جو افسوسناک

ت آمیز بعد پیدا ہو چکا ہے اسے ختم کیا جائے۔ افراد شر کے بنیادی حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ ان کی تعلیم و تربیت کے خود کفیل بنایا جائے۔ اکتساب رزق اور ترقی و خوشحالی ے مواقع سب شہریوں کو یکساں طور پر میسر ہونے چاہئیں۔ ن یہ حقیقت ہے کہ قرآن کا نظام نہ تو قوت کے بل بوتے پر نافذ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی سیاسی مصلحتوں کی آڑ میں۔ یہ نظام قلب و نگاہ کی تبدیلی سے لاگو ہوتا ہے۔ اس کیلئے عوام کی فکری راہنمائی کرنی پڑتی ہے۔ شورشوں' ہنگاموں اور اشتعال انگیزیوں سے یہ نظام مکمل طور پر ناکام ہو جاتا ہے۔ چونکہ طلوع اسلام کو ان حقائق کا پورا پورا احساس ہے اس لئے اس نے کبھی یہ راہ اختیار نہیں کی۔ اس نے ہمیشہ علمی کاوشوں کو ترجیح دی ہے۔ اس سلسلے میں خدا کے فضل و کرم سے نہایت مفید اور بصیرت افروز لٹریچر قوم کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ تنظیمی اعتبار سے بھی اس نے قابل تحسین کام کیا ہے۔ طلوع اسلام کی بزمیں' اندرون ملک اور بیرون ملک تقریباً ہر بڑے شہر میں قائم ہیں۔ یہ بزمیں ابلاغ عامہ اور درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان سے مستفید ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ روز بروز پھیل رہا ہے۔ طلوع اسلام کا یہ سارا نظم و نسق اور اس کی کامیابی اراکین طلوع اسلام کی محنت شاقہ اور ایثار و خلوص کی رہین منت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں نہ تو اقتدار کی ہوس ہے اور نہ ہی مال و زر کی۔ یہ اپنی محنت کا اجر کسی سے نہیں مانگتے' سوائے اللہ کے!

طلوع اسلام کا پاکستان کے نصب العین پر اٹل ایمان ہے۔ اس نے نظریہ پاکستان کی مخالفت کرنے والوں کا ہمیشہ ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ قومی وحدت اور یک جہتی کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا۔ اس کے پلیٹ فارم سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی نہ ہی کوئی ایسی تحریر پیش کی گئی جو قوم میں انتشار اور فتنہ و فساد کا موجب بنے۔ اس نے اپنے آپ کو سیاسی اور مذہبی تفرقہ بازی سے ہمیشہ دور رکھا اور ان لوگوں کی حوصلہ شکنی کی جو لسانی اور صوبائی تعصبات کو ہوا دیتے ہیں۔ اس کے نزدیک ملک و قوم کی وحدت اور امن و سلامتی ہر شے پر مقدم ہے۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ طلوع اسلام نے گذشتہ پچاس سال کے دوران بہت زیادہ ترقی کی ہے اور اس کا ہر کام قابل تحسین ہے۔ لیکن یہ سب کچھ حاصل کرنے کے باوجود تسلیم کرنا پڑے گا کہ طلوع اسلام اب بھی اپنی منزل سے بہت دور کھڑا ہے۔ اسے ابھی بہت راستہ طے کرنا باقی ہے۔ اس کے سامنے جو نصب العین ہے وہ بڑا کٹھن ہے۔ اسے پاکستان کے سیاسی و اقتصادی ڈھانچے کو قرآن کریم کے ابدی اصول و اقدار کے مطابق متشکل کرنا ہے۔ فی الحقیقت یہ پیغمبرانہ کام ہے۔ یہ نظام کی تبدیلی کا معاملہ ہے اور ملک کے سیاسی اور اقتصادی نظام پر جو لوگ چھائے ہوئے ہیں وہ نہایت بے ضمیر انسان ہیں۔ ان کے پاس قوت بھی ہے اور مال و دولت بھی۔ ان کی گرفت بڑی مضبوط اور دل پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کا ہاتھ جس کسی پر پڑ جائے اس کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ان پر نہ تو یتیموں' بیواؤں' مسکینوں اور محتاجوں کی آہوں اور سسکیوں کا اثر ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں خدا اور آخرت کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے مذموم مقاصد کے حصول کیلئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس لئے انہیں راستے سے ہٹانا آسان کام نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک یہ لوگ اقتدار کی مسندوں پر براجمان ہیں قرآنی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ علمی کاوشوں کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن اگر کوئی یہ سمجھے کہ یہ نظام محض علمی کاوشوں سے قائم ہو جائے گا تو یہ خام خیالی ہو گی یا پھر انکسار! یہ حقیقت ہمیشہ مدنظر رہے کہ جب تک علمی کاوشوں کے ساتھ مربوط سیاسی حکمت عملی اختیار نہیں کی جاتی' موجودہ نظام کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کئی تحریکیں اٹھیں' بلند پایہ علمی کام کئے لیکن سیاسی

حکمت عملی کی عدم موجودگی میں ان کے یہ کارنامے کتابوں تک محدود رہے۔ ان کی کاوشیں معاشرے میں حقیقی تبدیلی کا باعث نہ بن سکیں۔ آج ان کے پیروکار کتابیں بغلوں میں دابے ذہنی عیاشی کی لت میں گرفتار ہیں۔ یہ لوگ مجادلوں اور مباحثوں میں تو اپنا ثانی نہیں رکھتے لیکن عملی طور پر بالکل نکمے! ان کی بے عملی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ خود بھی نظریاتی بحثوں میں الجھے رہتے ہیں اور اپنے ساتھ پوری قوم کو بھی الجھائے رکھتے ہیں۔

ملکی' سیاسی و اقتصادی نظام کی تبدیلی کیلئے لازمی ہے کہ عوام کے سیاسی شعور کو اجاگر کیا جائے۔ اسے مثبت اور تعمیری خطوط پر استوار کیا جائے۔ عوام کے اندر رہ کر اور ان کے مزاج کو سمجھ کر کام کیا جائے۔ ان کی مشکلات و مسائل کا گہرا جائزہ لیا جائے۔ آج کل' جب کہ ہر طرف جمہوریت کا دور دورہ ہے عوام کے تعاون کے بغیر کوئی ٹھوس تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ ہم عن قریب اکیسویں صدی میں داخل ہونے والے ہیں۔ اس صدی میں بڑی بنیادی تبدیلیاں واقع ہونگی۔ رفتار زمانہ تیز تر ہو جائے گی۔ کاروان انسانیت بڑی برق رفتاری کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں ہو گا۔ جو قوم سستی دکھائے گی اسے ہٹایا نہیں' کچل دیا جائے گا۔ اس صدی میں بڑی تندہی اور مستعدی سے کام کرنا ہو گا۔ اگر طلوع اسلام کو زندہ رہنا ہے اور اکیسویں صدی میں اپنا مقام برقرار رکھنا ہے تو اسے اپنی موجودہ روش پر نظر ثانی کرنا ہو گی۔ اسے زمانہ کے تقاضوں کو سمجھنا ہو گا۔ قرآنی اصول و اقدار کی حکمرانی قائم کرنے کیلئے مربوط سیاسی حکمت عملی اختیار کرنی ہو گی۔ ورنہ اس کا پیغام وعظ بن کر رہ جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ سیاسی نظام جھوٹ اور مکر و فریب پر مبنی ہے۔ اس میں کامیاب وہ کہلاتا ہے جو سب سے زیادہ فریبی' دھوکہ باز اور جھوٹا ہو۔ جو گرگٹ کی طرح ہر آن رنگ بدلتا ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ملک میں مثبت اور تعمیری سیاست کی بالکل گنجائش نہیں۔ ایسی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ عوام کی اکثریت ابھی حق بات سننا پسند کرتی ہے۔ بلکہ سچ سننے کو ترس رہی ہے! طلوع اسلام کا فرض ہے کہ وہ سچ کو لوگوں کے دروازے تک پہنچائے۔ خود کو ان کے قریب کرے' ان کے مسائل کو اپنا سمجھ کر ان کی مدد کرے۔ طلوع اسلام عوام کے جس قدر قریب ہو گا اسے اتنا ہی زیادہ اعتماد حاصل ہو گا۔ اگلی صدی میں عوامی اعتماد کا حصول اس کی جدوجہد کا نقطہ ماسکہ ہونا چاہئے۔ اس کیلئے تمام ذرائع بروئے کار لائے جائیں۔ عوام سے رابطے کا جو بھی معروف طریقہ ہو اس پر عمل کیا جائے اور عوام کا سچا خادم بن کر دکھایا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی جدوجہد کو اس وقت تک جاری رکھا جب تک مکہ فتح نہ ہو چکا۔ اگرچہ اس دوران آپؐ نے ہر مخالفت کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن آپؐ کے دل میں بار بار یہ آرزو ابھر رہی تھی کہ جس مقام (مکہ) کو ہمارے نظام کا مرکز قرار دیا ہے اس پر قبضہ اور تصرف بھی ہمارا ہونا چاہئے۔ آپؐ کی نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اٹھتیں۔ اس کیلئے کہا: **قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ** ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہاری نگاہیں بار بار ہماری طرف اٹھ رہی ہیں کہ تولیت کعبہ چاہئے۔ **فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا** ٹھیک ہے یہ مرکز جو تمہارے نظام کیلئے پسند کیا گیا ہے۔ اس کی تولیت تمہیں ضرور ملے گی۔ لیکن اس کے حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ **فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** تم اپنی تمام توجہات اس نقطہ یعنی کعبہ کو غیر خداوندی قوتوں سے آزاد کروانے پر مرکوز کر دو۔ **وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ** تم دنیا کے کسی گوشے میں ہو اور زندگی کے کسی شعبے میں مصروف تگ و تاز ہو' تم اپنی توجہات کا رخ اسی سمت رکھو (3:144)۔ طلوع اسلام کی حکمت عملی بھی اس طرح کی ہونی چاہئے۔ اسے نشرواشاعت اور درس و تدریس کے ساتھ ساتھ اپنی اصل منزل پر بھی نگاہ رکھنی چاہئے اور وہ ہے دین کے نظام کا مکمل قیام۔ **هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ** (3:137-139)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سو سوالوں کا ایک جواب)

گذشتہ باون (52) سالوں میں نظریہ پاکستان اور اسلامی نظام کے الفاظ لاکھوں کروڑوں مرتبہ دہرائے گئے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ نظریہ پاکستان کا مفہوم کیا ہے' اور کسی نظام کے اسلامی یا غیر اسلامی قرار پانے کا معیار کیا۔ یہ تصورات اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے پیش کردہ تھے اور انہوں نے ان کا مفہوم اور مطلوب نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا تھا۔ ایک حصہ لا۔۔۔۔ کہ کیا چھوڑنا چاہئے اور دوسرا حصہ الا۔۔ کہ کیا اختیار کرنا چاہئے۔ اقبالؒ نے کہا تھا:

تمہارے دین کی یہ بلند فطری' ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات اور جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جسے صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر رکھا ہے۔ ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی' سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں.... کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں' نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

(خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس 1932ء)

اور حصہ الا کے متعلق قائداعظمؒ نے 1941ء میں حیدر آباد (دکن) میں طلباء کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

"اسلامی مملکت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت' دوسرے الفاظ میں' قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے"۔

یہ لا اور الا مل کر نظریہ پاکستان بن جاتے ہیں اور یہی اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار ہیں۔ اگر قرآن کے ساتھ کچھ اور شامل کر دیا جائے تو وہ شرک ہو جائے گا کیونکہ خود خدا کا ارشاد ہے کہ: **لا یشرک فی حکمه احدا**..... (18:26)- وہ اپنے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے' پیش آمدہ معاملات کا' باہمی مشاورت سے' حل تلاش کرنا' اسلامی نظام ہے۔

جو لوگ قائداعظمؒ اور اقبالؒ کے نقوش قدم پر چلنے کی تلقین کریں ان سے کہئے کہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے نقوش قدم تو یہ ہیں۔ آپ کس حد تک ان کی پیروی کر رہے ہیں جو دوسروں کو ان کے اتباع کی تلقین کرتے ہیں؟

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ

علامہ پرویزؒ تحریک حصول پاکستان کے دوران، حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کے تحریک پاکستان کی دینی اساس سے متعلق ذاتی مشیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔ 1938ء میں مجلّہ طلوع اسلام کا از سرِنو اِجراء حضرت علامہ اقبالؒ کی ایماء اور حضرت قائداعظمؒ کے ارشاد پر بایں غرض عمل میں لایا گیا تاکہ قوم کو بتایا جائے کہ اللہ اور اس کو رسول کے ارشادات کے مطابق اس مجوزہ مملکت پاکستان کی اہمیت کیا ہے۔ علامہ پرویزؒ نے یہ فریضہ اس حسن و عمدگی سے نبھایا اور نیشنلسٹ علماء کے مخالف پاکستان پراپیگنڈا کا اس خوبی سے تدارک کیا کہ حصول پاکستان میں قائداعظمؒ اور ان کے رفقاء کی کوششوں کو بارگاہ ایزدی سے شرفِ قبولیت حاصل ہوا اور مملکتِ پاکستان 14 اگست 1947ء کو معرض وجود میں آگیا۔ پرویز صاحب کی ان مساعی کی تفاصیل مجلّہ طلوع اسلام کے اس زمانہ کے فائلوں میں محفوظ تھی اور بالعموم عوام کی نگاہوں سے اوجھل! اب اسے ایک مستقل کتاب

تحریک پاکستان اور پرویز

کی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے۔

قیمت (علاوہ ڈاک، پیکنگ خرچ)

اعلیٰ ایڈیشن — 300

سٹوڈنٹ ایڈیشن — 150

مینیجر طلوع اسلام ٹرسٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لغات القرآن

دعا

اسلام کا ضابطہ آئین قرآن ہے اور قرآن کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ کا مفہوم خود متعین کر دیتا ہے۔ اسی لیے وہ کتاب مبین ہے' مذہبی منتروں کی کتاب نہیں ہے لیکن جب قرآن کا دین "مذہب" میں تبدیل ہو گیا تو اس کے الفاظ باقی رہ گئے لیکن ان کا مفہوم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ ہم صبح سے شام تک یہ الفاظ دہراتے رہتے ہیں لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ ان صفحات میں ایسی ہی منتخب اصطلاحات اور الفاظ کا مفہوم' جو زبان زد عام ہیں' قرآن کریم کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس بار قارئین کی فرمائش پر دعا کا مفہوم پیش خدمت ہے۔ (مدیر)

دعا کے معنے کسی کو پکارنے اور بلانے کے ہیں۔ چنانچہ **اَلدَّعَّاءَۃُ** اس انگلی (سبابہ) کو کہتے ہیں جس سے اشارہ کر کے کسی کو بلایا جائے۔ **اَلدَّاعِیَۃُ** جنگ میں گھوڑوں کی چیخ پکار کو کہتے ہیں۔ **ھُوَ مِنِّی دَعْوَۃَ الرَّجُل** کے معنی ہیں وہ مجھ سے اتنی دور ہے کہ وہاں تک آدمی کی آواز پہنچ جاتی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی کو اپنی آواز یا بات سے اپنی طرف مائل کرنا۔

دَعَاہُ اِلَی الْاَمِیْر کے معنی ہیں وہ اسے امیر کی طرف لے گیا۔ اس اعتبار سے **داع** صرف بلانے والے ہی کو نہیں کہتے بلکہ اسے بھی کہتے ہیں جو کسی کو کسی دوسرے کی طرف لے جائے۔ **اِدِّعَاءٌ**۔ (**یَدَّعُوْنَ**) کے معنی تمنا کرنے کے ہیں۔ یا کسی چیز کو پکار پکار کر بلانے کے (67:28)۔

تَدَاعَوْا عَلَیْہِ کے معنی ہیں وہ اس کے خلاف جمع ہو گئے۔ اور **تَدَاعٰی عَلَیْہِ الْعَدُوُّ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ** کے معنی ہیں دشمن نے ہر طرف سے اس پر حملہ کر دیا۔ **تَدَاعَتِ الْحِیْطَانُ** کے معنی ہیں دیواریں یکے بعد دیگرے گر پڑیں۔ (تاج)

دَعَوْتُہٗ زَیْدًا۔ میں نے اس کا نام زید رکھ دیا۔ **اَلدَّعِیُّ**۔ وہ لڑکا جسے متبنیٰ بنا لیا جائے۔ (اس کی جمع **اَدْعِیَاءُ** ہے 33:4)۔

اَلدَّاعِیَۃُ۔ (تاج) (محیط) اس دودھ کو کہتے ہیں جسے تھنوں میں اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اس کے سہارے باقی ماندہ دودھ نکالا جا سکے۔ نیز سبب یا باعث۔ **اَلدَّوَاعِیْ**۔ ان چیزوں کو کہتے ہیں جو انسان کے جذبات کو ابھار دیں اور اس کے اندر ہیجان پیدا کر دیں۔ (ان معانی کو اچھی طرح پیش نظر رکھنا چاہئے کیونکہ ان سے **دعا** کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے)۔

وَ ادْعُوْا شُھَدَاءَکُمْ (2:23) کے معنی ہیں تم اپنے مددگاروں کو بلاؤ۔ سورۃ کہف میں **نَادٰی** اور **دَعَا** دونوں مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں (18:52)۔ سورۃ اعراف میں دعا کے مقابل میں **صَمَتَ** کا لفظ آیا ہے (7:193)۔ جس کے معنی چپ رہنے کے ہیں۔ لہٰذا دعا کے معنی پکارنے یا بلانے کے ہوئے۔

سورۃ بقرہ میں ہے **فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ** (2:61)۔ جس کے معنی ہیں ہمارے لئے اپنے پروردگار کو پکار۔ **اَلدَّعْوٰی**۔ پکار' مطالبہ' تقاضا۔ (10:10)

اب ہمارے سامنے دعا کا وہ گوشہ آتا ہے جو مذہب اور فلسفہ کی دنیا میں سب سے مشکل مسئلہ سمجھتا جاتا ہے اور جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے سے طرح طرح کے شکوک اور

خدشات لاحق ہو جاتے ہیں۔ یہ گوشہ ہے "خدا سے دعا مانگنے" کا۔ ان شکوک و خدشات کو سمجھنے کے لئے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ایک مثال پر غور کیجئے۔ کسی مقدمہ میں زید مدعی ہے اور بکر مدعا علیہ۔ زید خدا سے دعا کرتا ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ اس سے حسب ذیل سوالات سامنے آتے ہیں۔

(الف) ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کے تمام معاملات کے فیصلے خدا کے ہاں پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیز بھی پہلے سے طے شدہ ہو گی کہ اس مقدمہ میں زید کو شکست ہو گی یا فتح۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ پہلے سے طے شدہ تھا کہ زید کو شکست ہو گی تو کیا زید کے دعا کرنے سے خدا اپنے پہلے فیصلے کو بدل دے گا اور زید مقدمہ ہارنے کے بجائے جیت جائیگا؟ اگر ایسا ہو تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ خدا اپنے فیصلوں کو انسانوں کی مرضی کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ یعنی خدا' انسانوں کی مرضی کے تابع چلتا ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

(ب) فرض کیجئے کہ زید اپنے دعویٰ میں جھوٹا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کے دعا کرنے سے' خدا مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں کر دیگا؟ اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ خدا نے جھوٹے کے حق میں فیصلہ کر دیا اور سچے کو اس کے حق سے محروم کر دیا۔ خدا کے متعلق یہ تصور بھی غلط ہے۔

(ج) فرض کیجئے کہ زید اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔ اگر زید خدا سے دعا نہ کرے تو کیا مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ہو گا یا نہیں؟ اگر دعا کے بغیر فیصلہ اس کے حق میں نہیں ہو سکتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا از خود سچے کے حق میں فیصلہ نہیں دیتا۔ سچے کو اپنے حق میں فیصلہ لینے کے لئے خدا سے منت خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور بھی غلط ہے۔

اور اگر خدا سچے کے حق ہی میں فیصلہ کرتا ہے خواہ وہ دعا کرے یا نہ کرے' تو زید کے دعا کرنے یا نہ کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑیگا۔ خدا کو بہرحال اس کے حق میں فیصلہ کرنا تھا۔ اس صورت میں دعا ایک بیکار عمل ہوا۔

(د) یہ ظاہر ہے کہ مقدمہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انسان کو کوشش کرنی پڑتی ہے۔ ناجائز نہ سہی' جائز ہی سہی کوشش تو ضرور کرنی پڑتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر زید صرف دعا کرے لیکن کوشش نہ کرے تو کیا وہ مقدمہ جیت جائیگا؟ اگر وہ صرف دعا سے مقدمہ جیت جائے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے عمل (کوشش کرنے) پر جو اس قدر زور دیا ہے تو وہ سب بیکار ہو گا۔

اور اگر کوشش کے بغیر مقدمہ نہیں جیتا جا سکتا تو پھر دعا کا فائدہ کیا ہوا؟

(س) اگر زید اپنی جگہ خدا سے دعا کرے اور بکر اپنی جگہ۔ تو پھر مقدمہ کا فیصلہ کس کے حق میں ہو گا؟ خدا کس کی دعا قبول کریگا اور کس کی رد کریگا؟

یہ اور اس قسم کے اور بہت سے شکوک و خدشات ہیں جو دعا کے اس مفہوم سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے حل کرنے کے لئے مذہب اور فلسفہ صدیوں سے (ناکام) کوششوں میں مصروف ہیں۔ قرآن کریم نے بتایا کہ دعا کا یہ تصور غلط ہے اور اس دور کا پیدا کردہ جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا اور کائنات میں قانون اسباب (Law of Causality) کے تصور سے ناآشنا تھا۔ اس نے بتایا کہ

(1) کائنات میں ہر شے خدا کے لگے بندھے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے اور خدا اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔ **وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً** (33:62)۔ "تو قانون خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں پائیگا"۔

(2) انسانی دنیا میں بھی خدا ہی کا قانون کارفرما ہے۔ جو شخص اس قانون کے مطابق جس قدر کوشش کریگا اسی قدر وہ کامیاب ہو گا۔ **لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ وَ اَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى** (53:39-40)۔ "انسان کے لئے اس کے سوا کچھ نہیں جس کی وہ کوشش کرے۔ اور اس کی کوشش کا نتیجہ بلا تاخیر سامنے آجائیگا"۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ جو شخص خدا

قانون کے مطابق کوشش نہیں کرتا اور محض دعا مانگنے سے سمجھتا ہے کہ مقصود حاصل ہو جائیگا' اس کا نہ تو خدا کے متعلق تصور صحیح ہے اور نہ ہی اسے کبھی کامیابی ہو سکتی ہے۔ سورۃ رعد میں ہے لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ۔ انسان کی جو دعوت تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے جو حق پر مبنی قرار پا سکتی ہے وہ وہی دعوت ہے جو خدا کے لئے (یعنی اس کے قانون کے مطابق) ہو۔ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ۔ اور جو لوگ خدا کے علاوہ اوروں سے اپنی طلب وابستہ کرتے ہیں۔ یعنی چاہتے ہیں کہ خدا کے قانون کو چھوڑ کر' اپنی توہم پرستیوں کے زور پر کامیاب ہو جائیں' تو وہ غلطی پر ہیں۔ ان کی یہ خود ساختہ قوتیں ان کی کوئی مانگ پوری نہیں کر سکیں گی۔ ایسے لوگوں کی مثال كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ہے' یعنی جیسے کوئی شخص (دریا کے کنارے) اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا کر بیٹھا رہے (اور دعا کرتا رہے کہ پانی اس کے منہ میں آجائے تو) اس طرح پانی اس کے منہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا' وَمَا دُعَآءُ الْكَافِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلَالٍ (13:14)_ جو لوگ خدا کے قانون سے انکار کرتے ہیں ان کی دعا کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا.... (13:15)_ کائنات کی ہر شے' طوعاً" و کرھاً" خدا کے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ سو جب ساری کائنات کا سلسلہ خدا کے قانون کے مطابق چل رہا ہے' تو انسان اس سے مستثنیٰ کس طرح ہو سکتا ہے؟

لہٰذا' قرآن کریم کی رو سے "خدا سے دعا" کے معنی ہیں خدا کے قانون سے مدد چاہنا۔ یعنی اس کی اطاعت سے اپنی کوششوں میں صحیح نتائج مرتب کرانا۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح کر دیا ہے۔ مثلاً سورۃ المومن میں ہے وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ تمہارا نشوونما دینے والا کہتا ہے کہ تم مجھے پکارو۔ میں تمہاری پکار کا جواب دونگا (اس کا مفہوم ذرا آگے چل کر بیان کیا جائیگا)۔ اس کے بعد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ (40:60)_ یقیناً جو لوگ میری محکومیت اختیار کرنے سے سرکشی برتتے ہیں' وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوتے ہیں۔ آیت کے دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ "خدا کو پکارنے" سے مراد اس کے احکام و قوانین کی محکومیت اختیار کرنا ہے اور خدا کی طرف سے اس پکار کا جواب ملنے سے مراد انسان کی سعی و کاوش کا ثمربار ہونا۔ دوسرے مقام پر اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (32:15)_ ہمارے احکام پر ایمان لانے والے وہی لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے وہ احکام پیش کئے جاتے ہیں تو وہ سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اپنے نشوونما دینے والے (کے پروگرام کو) در خور حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اور وہ ان احکام سے سرتابی نہیں کرتے۔ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (32:15_16)_ وہ ان احکام کی تعمیل میں اس طرح سرگرم عمل رہتے ہیں کہ نیند تک کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ راتوں کو بھی جاگتے ہیں اور اس طرح اپنے رب کو دفع مضرت اور جلب منفعت کے لئے پکارتے ہیں۔ کیونکہ انہیں علم ہوتا ہے کہ ان احکام کی تعمیل سے کیسے عمدہ نتائج مرتب ہونگے اور ان کی خلاف ورزی سے کس قدر تباہیاں آئیں گی' جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہوتا ہے وہ اسے (نوع انسانی کی بہبود کے لئے) کھلا رکھتے ہیں۔ سورۃ المومن میں ہے فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ... (40:65)_ خدا کو پکارو تو اس طرح کہ فرماں پذیری کے ہر گوشے کو خالصتہً" اسی کے لئے وقف اور مختص کر دو۔ سورۃ شوریٰ میں ہے وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ.... (42:26)_ "وہ ان کی پکار کا جواب دیتا ہے جو اس کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے مطابق صلاحیت بخش کام کرتے ہیں"۔ یہاں سے بھی واضح ہے کہ "پکار اور اس کے جواب" سے مفہوم کیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا

اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (7:55)۔ "تم اپنے نشوونما دینے والے کو دل کے پورے جھکاؤ اور سکون سے پکارو۔ اس طرح کہ یہ پکار تمہارے دل کی گہرائیوں سے نکلے۔ یاد رکھو! جو لوگ اس کے قانون سے سرکشی برتتے ہیں اور حد سے تجاوز کر جاتے ہیں' وہ انہیں کبھی پسند نہیں کرتا" اس سے بھی واضح ہے کہ "خدا کو پکارنے" سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اس سے اگلی آیت نے اسی مفہوم کی تشریح کر دی ہے جہاں کہا ہے وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا۔ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (7:56_57)۔ یعنی تم معاشرہ میں ہمواری پیدا ہو جانے کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ اور خدا کو دفع مضرت اور جلب منفعت کے لئے پکارو۔ یاد رکھو! جو لوگ حسن کارانہ انداز سے معاشرہ کا توازن قائم رکھتے ہیں' خدا کی رحمت ان سے بہت قریب ہوتی ہے"۔

یہاں "خدا کی رحمت" کو قریب کہا ہے۔ سورۃ بقرہ میں خود خدا کے متعلق کہا ہے کہ وہ قریب ہے۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ "اور جب میرے بندے تجھ سے میری بابت پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں (کہیں دور نہیں ہوں۔ ان سے بہت) قریب ہوں۔ (ان کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب۔ 50:16)۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے"۔ اس کے بعد ہے۔ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ (2:186)۔ "پس انہیں چاہئے کہ میری فرمانبرداری کریں اور میرے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں۔ تاکہ یہ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ پا لیں"۔

اس سے واضح ہے کہ خدا کو پکارنے (دعا) سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اور دعا کا جواب دینے سے مفہوم اس اطاعت پذیری کے نتائج مرتب ہونا۔

سورۃ نمل میں پہلے کائناتی نظام کے مختلف گوشوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہاں کس طرح یہ بات خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے بعد' اس جماعت مومنین کو مخاطب کیا گیا ہے جو اپنے نظام کے ابتدائی مراحل میں سخت مصیبتوں اور پریشانیوں سے گذر رہی تھی اور قدم قدم پر پکار رہی تھی کہ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ (2:214)۔ خدا کی نصرت کب آئیگی؟ ان سے کہا کہ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ... (27:62)۔ (خدا کے علاوہ) وہ کون ہے جو (تمہارے) قلب مضطر کی پکار کا جواب دیتا ہے اور تمہاری پریشانیوں اور مشکلات کو دور کر کے تمہیں استخلاف فی الارض عطا کر سکتا ہے! لیکن یہ استخلاف فی الارض' تمہارے اعمال کے نتیجہ میں مل سکے گا (24:55)۔ اس لئے تم گھبراؤ نہیں۔ خدا کے قانون کے مطابق عمل کرتے جاؤ۔ وہ تمہاری بے کسی اور بے چارگی کو غلبہ و تسلط سے تبدیل کر دیگا۔ اگر تم اس راستے پر چلتے رہے تو ہماری کائناتی قوتیں' ان مخالفین کی ضرر رسانیوں سے تمہاری حفاظت طلب کرتی رہے گی (40:7)۔ جماعت مومنین تو ایک طرف' خود حضرات انبیاء کرامؑ سے بھی یہی کہا گیا۔ مثلاً سورۃ یونس میں حضرت موسیٰؑ کے قصہ کو دیکھئے۔ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ فرعون کا مقابلہ کرنے کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔ اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا ہے۔ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِیْمَا (10:89)۔ تم دونوں کی "دعاء قبول ہو گئی ہے"۔ بس اب تم اپنے پروگرام پر پوری پوری استقامت کاربند رہو۔ ظاہر ہے کہ اگر دعاء قبول ہو جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ جو کچھ تم نے مانگا ہے وہ تمہیں دیدیا گیا ہے (یا وہ تمہیں مل جائیگا) تو اس کے بعد اس کے لئے کسی کوشش کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن یہاں کہا یہ گیا ہے کہ تمہاری دعا قبول ہو گئی ہے۔ لہٰذا اب تم نہایت استقامت سے اس پروگرام پر کاربند رہو۔ اس سے واضح ہے کہ جو کچھ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے کہا گیا تھا وہ فقط اتنا ہی تھا کہ تمہاری یہ آرزوئیں ہمارے قانون کے مطابق ہیں لہٰذا تم ان کے حصول میں نہایت مستقل مزاجی سے کوشش کرو۔ تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو

سے خدا سے دعا کرنے کے معنی اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کرنا ہیں۔ اسی "دعا" کا حکم رسول اللہؐ کو دیا گیا تھا۔ **قُلْ اِنَّمَا اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِکُ بِهٖٓ اَحَدًا** (72:20)۔ ان سے کہدو کہ میں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس میں کسی اور کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرتا۔ یعنی اس کی حاکمیت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا (18:26)۔

"دعا" کے اس قرآنی مفہوم کے بعد ان شکوک و خدشات کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

اب ذرا آگے بڑھئے۔ جن باتوں کو ہم اپنی اصطلاح میں "دعا" کہتے ہیں' قرآن کریم میں وہ بھی ہیں۔ مثلاً **رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا۔ وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ** (3:146)۔ "اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہماری کوتاہیوں' اور معاملات میں حد سے بڑھ جانے کے مضر نتائج سے ہماری حفاظت کر۔ ہمارے قدموں کو استقامت عطا فرما اور ہمیں قوم کفار پر کامیابی عطا کر"۔ یعنی وہ دعائیں جن میں انسان اپنی کسی آرزو کے بر آنے کی درخواست کرتا ہے۔ یہ دعائیں در حقیقت انسان کی آرزو کی شدت کا مظہر ہوتی ہیں۔ اس شدت آرزو سے انسان کی اپنی ذات میں ایسا تغیر واقع ہوتا ہے جس سے اس کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور مضمر صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں۔ ان کی وجہ سے اس کا عزم راسخ اور ہمت بلند ہو جاتی ہے اور وہ موانعات کا مقابلہ کرنے اور شدائد پر غلبہ پا لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ (**الداعیة** اور **الدواعی** کے جو معنی پہلے دیئے گئے ہیں۔ ان پر غور کیجئے) یعنی سب سے پہلے انسان وہی کچھ چاہے جو قانون خداوندی کے مطابق ہو پھر اس مقصد کے حصول کے لئے آرزو میں شدت پیدا کرے۔ اس سے اس کے اندر ایسی انقلابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتائج حیرت انگیز ہوتے ہیں (واضح رہے کہ قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ تمہاری ہر آرزو' قانون خداوندی کے مطابق ہونی چاہئے' ورنہ تم وہ کچھ طلب کرنے لگ جاؤ گے جو تمہارے لئے در حقیقت مضر ہو گا۔ (17:11)۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ۔

ترى دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

کہا جا سکتا ہے کہ اگر انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے اپنے اندر ویسے ہی شدت آرزو پیدا کر لے تو اس سے بھی اس کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ پھر اس میں اور خدا سے دعا کرنے میں کیا فرق ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ اس طرح بھی انسان کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں لیکن مقصد صرف قوتوں کی بیداری نہیں۔ سب سے پہلی چیز خود مقصد کا تعین ہے۔ یعنی وہ مقصد ہے کیا جس کے حصول کیلئے آرزو کی جا رہی ہے اور وہ ہے کیسا؟۔ پھر اس کے حصول کیلئے طریقے کیا کیا اختیار کئے جائیں گے۔ اور اس تمام سعی و کاوش کے ماحصل کو کس مصرف میں لایا جائیگا۔ ایک مرد مومن (قرآنی انسان) ان تمام امور کا فیصلہ خدا کے احکام کی روشنی میں کرتا ہے اس لئے وہ' پہلے قدم سے آخری قدم تک' خدا کو اپنے سامنے رکھتا ہے۔ اس کی طلب و آرزو کی شدت بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کے لئے بھی خدا ہی کو پکارتا ہے۔ خدا کی طرف سے سب کچھ اس کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ دعا کے نتیجہ میں انسان کی خفیہ قوتوں کی بیداری بھی اس کے قانون ہی کے مطابق ہوتی ہے۔ علاوہ بریں' ایک اور بھی نقطہ ہے جس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ خدا نے انسانی ذات میں ایسی صلاحیت دے رکھی ہے کہ وہ مناسب نشوونما سے اپنے اندر (علیٰ حد بشریت) ان صفات کو اجاگر کرتی جائے جنہیں (لامحدود طور پر) صفات خداوندی یا الاسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے خدا کی ذات (یعنی ان صفات حسنیٰ کی حامل ذات) انسانی ذات کی نشوونما کے لئے معیار (Standard) بن جاتی ہے۔ انسان کا اپنی شدت آرزو میں خدا کو پکارنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر ان صفات خداوندی کو اجاگر کرنا چاہتا ہے جن سے مقصد پیش نظر میں کامیابی ہو جائے۔ یہ ہے فرق "خدا سے دعا مانگنے" اور اپنے طور پر شدت آرزو پیدا کرنے میں۔

اب رہیں حضرات انبیاء کرامؑ کی وہ ذاتی دعائیں جن کا ذکر قرآن میں ہے۔ سو نبوت کا معاملہ عام انسانی معاملات سے بالکل الگ ہے۔ اس کے متعلق ہم نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں۔ ہم ان کے لائے ہوئے پیغام کو سمجھتے ہیں اور اسی کی اطاعت ہمارا فریضہ ہے۔ باقی رہا ان کی دعاؤں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جس طرح خدا ان کی دعا کے جواب میں ان سے ہم کلام ہوتا تھا' اسی طرح دیگر (غیر از انبیاء) انسانوں سے بھی ہم کلام ہو سکتا ہے تو یہ چیز وحی اور نبوت کے قرآنی تصور کے یکسر خلاف ہے۔ خدا' حضرات انبیاء کرامؑ کے علاوہ کسی انسان سے ہم کلام نہیں ہوتا اور نبی اکرمؐ کے بعد ایسا سمجھنا ختم نبوت کی مہر کو توڑنا ہے۔

نہ ہی یہ عقیدہ صحیح ہے کہ خدا ہماری دعا کو نہیں سنتا اس لئے "خدا کے کسی مقرب" سے درخواست کی جائے کہ وہ ہمارے لئے خدا سے دعا کرے۔ قرآن کی رو سے خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہو سکتی۔ ایسا سمجھنا شرک ہے۔ "خدا تک پہنچنے" یا اس تک اپنی آواز پہنچانے کے لئے کسی ذریعے اور واسطے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر انسان' اس کے قوانین کے اتباع سے "اس تک پہنچ سکتا ہے" اور اپنی آواز اس تک پہنچا سکتا ہے۔ اس کے قوانین کا اتباع' قرآنی معاشرہ کے اندر رہ کر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جو دعائیں مومنین کے لئے بتائی ہیں وہ عام طور پر اجتماعی ہیں۔ مثلاً (3:192, 3:146, 3:7, 2:286, 2:201, 1:5_7)۔

سورۃ بقرہ کی جو آیت اوپر درج کی گئی ہے۔ یعنی **وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ** (2:186)۔ "جب تجھ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو (ان سے کہدو کہ) میں قریب ہوں"۔ یا **نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ** (50:16)۔ "میں انسان سے اس کی رگ جان سے بھی قریب ہوں"۔ تو ان میں ضمناً" خدا کے موجود فی الکائنات (Immanence) اور خارج از کائنات (Transcendence) کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ وہ ہر انسان سے' اس کی رگ جان سے بھی قریب ہے۔ تو اس سے ظاہر ہے کہ خدا کائنات میں ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن اس طرح موجود نہیں جس طرح کوئی چیز کسی خاص مقام میں مقید ہوتی ہے۔ چونکہ ہمارے حواس کسی ایسی شے کا تصور نہیں کر سکتے جو مکان (Space) کے اندر مقید نہ ہو اس لئے ہم اسے سمجھ ہی نہیں سکتے کہ خدا' اس کائنات میں' بغیر جگہ (Space) گھیرے کس طرح موجود ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہہ دیا ہے کہ **لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ** (6:104)۔ انسانی نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ لیکن وہ انسانی نگاہوں کا ادراک و احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن اس کے قانون کا ہم ادراک بھی کر سکتے ہیں اور نتائج سے اس کا مشاہدہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے ہمارا تعلق خدا کے قانون سے بتایا ہے۔ خود خدا کی ذات سے نہیں۔ **دعا** (پکارنے) کا تعلق بھی خدا کے قانون سے ہے۔ ہم اس کے قانون کو آواز دیتے ہیں اور جب ہم اس کے مطابق عمل کرتے ہیں تو وہ ان اعمال کے مشہود نتائج کو سامنے لا کر ہماری پکار کا جواب دیتا ہے۔

باقی رہا خدا کا علم' سو جس چیز کو ہم "ماضی۔ حال۔ مستقبل" کہتے ہیں' علم خداوندی کی رو سے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ خدا کے سامنے ماضی' حال اور مستقبل سب بیک وقت (Eternal now کی شکل میں) موجود ہوتے ہیں۔ یعنی اسے ہونے والے واقعات کا اس طرح علم ہوتا ہے جیسے وہ سامنے اس وقت ہو رہے ہوں۔ لیکن اس چیز کا ہمارے اس اختیار و ارادے پر کچھ اثر نہیں پڑتا جو ہمیں خدا نے عطا کیا ہے۔ نہ ہی اس بات پر کوئی اثر پڑتا ہے کہ ہمارے لئے جو کچھ ہوتا ہے وہ ہمارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سب کچھ خدا کے سامنے ہو رہا ہوتا ہے (اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے) لیکن وہ ہمارے اختیار و ارادہ کو سلب نہیں کرتا۔ ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ اگر ہم خدا کے قانون کے مطابق کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ خوشگوار ہوتا ہے۔ اس کے خلاف کرتے ہیں تو نقصان اٹھاتے ہیں۔ کسی میں اس کی طاقت نہیں کہ خدا کے قانون کے خلاف کرے اور اس کا نتیجہ خوشگوار مرتب کرے۔ خدا کے قانون کے مطابق قدم اٹھانا' خدا کو پکارنا یا دعا کرنا ہے۔ اور اس کا خوشگوار نتیجہ مل جانا' دعا کا قبول ہو جانا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبال ادریس، مینگورہ سوات

کافرگری

قارئین کرام! اقبال ادریس صاحب کا اصل مضمون پیش خدمت ہے جو روزنامہ اوصاف اسلام آباد میں کانٹ چھانٹ کے بعد "پرویزیوں کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا" کے عنوان سے شائع ہوا۔ (مدیر طلوع اسلام)

بدقسمتی سے ہمارے ہاں "اقامت دین" کے علمبرداروں کا انداز یہ ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے جھوٹ بولا جائے۔ مغالطہ دیا جائے۔ مبہم الفاظ استعمال کئے جائیں۔ مختلف حربوں سے فضا میں اس قسم کے اثرات پیدا کئے جائیں جس سے لوگوں کو معلوم ہو کہ دین، علم، فکر، اسلام کا درد، ملت کی بہبود، سب سمٹ سمٹا کر انہی حضرات کے دل و دماغ میں آ چکے ہیں اور ان سے باہر جتنے لوگ بستے ہیں، وہ جاہل ہیں اور بے ایمان بھی۔ فکر و شعور سے عاری بھی ہیں اور بددیانت بھی۔ اس کی تازہ مثال مورخہ 28 اگست 1999ء بروز ہفتہ روزنامہ "اوصاف" اسلام آباد میں شائع ہونے والا اشتہار ہے جس میں حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ "پرویزیوں" (مزعومہ) کو سرکاری طور پر غیر مسلم قرار دیا جائے۔ اس اشتہار میں ان تمام فرقوں، تنظیموں اور پارٹیوں کے نام دیئے گئے ہیں جن کا متفقہ فیصلہ ہے کہ "پرویزی" کافر ہیں۔

اگر ملک میں واقعی کوئی "پرویزی" فرقہ ہے اور ان کے عقائد سے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جنت اور دوزخ کا انکار ثابت ہوتا ہے تو وہ واقعی دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ لیکن مذہب کے ان علمبرداروں نے تحریک طلوع اسلام اور بزمہائے طلوع اسلام کو "پرویزیت" کا نام دے کر جس بددیانتی اور سفلہ پن کا مظاہرہ کیا ہے اس پر دیانت و صداقت ماتم کر رہی ہوگی۔

تحریک طلوع اسلام سے علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ سے ان لوگوں کی دشمنی آج کی نہیں بلکہ اس وقت سے ہے جب تحریک پاکستان کی لڑائی میں مذہب کے اجارہ دار ایک طرف اور قائداعظمؒ کی مدبرانہ قیادت میں طلوع اسلام اور علامہ غلام احمد پرویزؒ دوسری طرف تھے۔ یہ لوگ وہ چوٹ آج تک نہیں بھولے کہ دین کے محاذ پر "نظریہ پاکستان" کے تحفظ کا تاج طلوع اسلام اور علامہ پرویزؒ کے سر پر سجا تھا اور ان تمام دشمنان نظریہ پاکستان کو شکست فاش ہوئی تھی۔

کسی پر بہتان تراشی اور جھوٹ باندھنے سے انسان کو جو چیز روک سکتی ہے وہ ہے "یوم آخرت" پر ایمان۔ روز محشر کسی کے سامنے جوابدہ ہونے اور اللہ کے ہاں باز پرس کا احساس۔ مذکورہ اشتہار کے مطابق بانی تحریک طلوع اسلام علامہ غلام احمد پرویزؒ نے نماز، زکوٰۃ، حج، جنت اور دوزخ سے متعلق آیات قرآنی اور حضور ﷺ کی احادیث سے انکار کیا ہے۔ اس کذب و افتراء کی کسی عام مسلمان سے توقع نہیں کی جاسکتی کجا کہ مذہب کے علمبردار دھڑلے سے اسے دہراتے چلے جائیں۔ یہ حضرات علامہ پرویزؒ کی کتابوں سے اقتباسات، سیاق و سباق سے الگ کرکے سادہ لوح عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جسے ہمارے تن آسان اور مطالعہ سے گھبرانے والے "پڑھے لکھے" حضرات بغیر سوچے سمجھے قبول کر لیتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کے پاس پروپیگنڈہ کی وسیع مشینری (محراب و منبر) موجود ہے اس لیے خوف خدا اور اسوۂ رسول ﷺ کو بھول کر اس مقدس مقام سے ایسے ایسے جھوٹ بولے جاتے ہیں کہ شیطان بھی پناہ مانگے۔

اگر ان حضرات کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے اور قرآن مجید ان کی زندگی کے نصاب میں شامل ہے تو اسی قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "فرقہ بندی شرک ہے" اور "پارٹی بازی خدا کا عذاب"۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (30:31-32)

مفہوم: اور مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے ایک دین میں فرقے بنا لئے اور گروہ ہوگئے۔ (اور حالت یہ ہوگئی کہ) ہر فرد اپنے ہی مسلک پر فرحت محسوس کرتا ہے (کہ میں حق پر ہوں باقی سب باطل ہیں)۔ وہ رسول ﷺ (فداہ امی وابی) جس کی سنت کو زندہ کرنے کے لیے یہ حضرات ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اس کو مخاطب کرکے پروردگار نے فرمایا۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (6:160)

مفہوم: جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے بنا لئے اور گروہ گروہ ہوئے۔ اے رسول ﷺ آپ کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

اب ذرا اس تفصیل کو ملاحظہ کیجئے جو اخبار میں آئی ہے کہ "مندرجہ ذیل دینی اور علمی اسلامی اداروں اور تنظیموں نے بزم طلوع اسلام کے غلام احمد پرویزؒ اور اس کے متبعین کے کفر و ارتدا پر اجماع کیا ہے اور فردا" فردا" فتاوی صادر کئے ہیں"۔ اور اس کے بعد مختلف فرقوں اور تنظیموں (بشمول چند سیاسی پارٹیوں کے) نام دیئے گئے ہیں۔

یہاں جتنی بھی دینی' علمی اور اسلامی تنظیموں کے نام دیئے گئے ہیں ان کے ارکان ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا تو درکنار ایک دوسرے کو کافر تک قرار دے چکے ہیں (یہ لوگ کبھی کسی بات پر اتفاق نہیں کرتے' ہمیشہ باطل پر متفق ہوتے ہیں) اگر یہ حضرات اور ان کی تنظیمیں خدائے واحد اور اس کی نازل کردہ کتاب قرآن مجید پر ایمان کے مدعی ہیں تو یہ تمام نام نہاد "نام" چھوڑ کر صرف ایک "اسلام" کے داعی بن جائیں۔ اپنی الگ دکان سجانے کی بجائے قرآن کے جھنڈے تلے جمع ہو کر خالص قرآن کے نظام کے لیے آواز اٹھائیں۔ لیکن! نہیں! یہ ایسا ہرگز نہیں کریں گے کیونکہ اس سے ان کے مفادات وابستہ ہیں اور ان کی دکانداری کو خطرات درپیش ہیں۔ پھر ان کو علامہ' ڈاکٹر اور مولوی مولانا کون کہہ کر پکارے گا۔ یہ خطابات تو "علم" کی بنیاد پر ملتے ہیں اور ان کا مبلغ علم چند فقہی کتابوں تک محدود ہے۔

یہ عوام کے پیسے پر شاہ خرچیاں اور یورپی ممالک کے دورے کرتے ہیں (اور بقول مولانا زاہد الراشدی صاحب اپنے ملک میں گرمیوں کا موسم گذارنے سے گھبراتے ہیں) اسلام کے نام پر پارٹی بازیاں کرتے اور مسلمانوں کو گروہوں اور فرقوں میں تقسیم کرتے ہیں اور ان تنظیموں کے نام پر ایک دوسرے کا خون خرابہ کرتے ہیں' جس سے روزانہ اخبارات کی سرخیاں بھتی ہیں۔ یہ جو دوسروں پر "کافر گری" کی سنگ باری کرتے ہیں' خود اپنے بارے میں قرآن کی مذکورہ بالا آیات (30:31-32) اور (6:160) کی رو سے کیا فیصلہ کرتے ہیں؟ اگر جرات اور غیرت کے مفہوم سے یہ آشنا ہوتے تو اس تناظر میں اپنا جائزہ لیتے۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر فیصلہ کرکے اپنے آپ کو گمراہی و ضلالت کے عمیق گڑھوں سے نکلنے کی کوئی سبیل سوچتے۔

تحریک طلوع اسلام اور علامہ غلام احمد پرویزؒ سے ان کی دشمنی کی ایک اہم وجہ قرآنی تعلیم کی وسعت آشنائی ہے۔ قرآن کا نظام قائم ہونے کے بعد نہ کوئی سنی رہے گا' نہ شیعہ' نہ حنفی' نہ مالکی' نہ شافعی' نہ حنبلی' نہ اہل حدیث' نہ اہل ذکر' نہ اہل قرآن' نہ جماعت اسلامی اور نہ جمعیت العلماء اسلام (بشمول تمام گروپس)۔ اس وقت تو صرف "مسلم" ہوگا۔ اس نظام میں "مترفین" کا کوئی گروہ نہیں ہوگا۔ مفت کی روٹیاں' حلوے اور ڈالرز کے جلوے میسر نہیں ہوں گے۔ مذہبی پیشوائیت ہی مترفین کا وہ گروہ ہے' سہل انگاری' تن آسانی' عشرت پسندی' دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنا جن کا وطیرۂ حیات بن گیا ہے۔

یہ لوگ اللہ کے راستہ کی طرف رہنمائی کرنے کے بجائے اللہ کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر یہ طلوع اسلام کی انقلابی تحریک کی مخالفت ضروری سمجھتے ہیں۔

جس "نظریہ پاکستان" کے تحفظ کے لیے آج یہ کمر باندھ کر میدان میں اترے ہیں کیا اس وقت یہی نظریہ "مطالبہ پاکستان" نہیں تھا جس کی مخالفت ان کے دین و ایمان کا حصہ تھی اور کیا یہی لوگ قائداعظمؒ کو "کافر اعظم" کے لقب سے نہیں پکارتے تھے۔ ان کی بھرپور مخالفتوں اور عناد کے باوجود جب پاکستان بن گیا تو یہ تمام حضرات یلغار کرکے پاکستان چلے آئے۔ اور یہاں "اسلامی نظام" کے مطالبہ کی رٹ لگانا شروع کر دی۔ مگر یہ کون سا اسلام یہاں نافذ کرنا چاہتے ہیں؟ یہ ان کے ایجنڈے میں شامل نہیں ہے کہ اس پر ان کا اتفاق ممکن نہیں۔

طلوع اسلام کے لٹریچر پر یہ لوگ پابندی کا مطالبہ اس لیے کر رہے ہیں کہ انہیں ڈر ہے کہ اگر کہیں یہ "قرآنی فکر" عام ہوگئی (اور الحمد للہ یہ عام ہوتی جا رہی ہے) تو ان کا کیا ہوگا۔ قرآنی نظام میں کوئی مولوی' مولانا ہوتا ہے اور نہ اجرتی پیش امام۔ مذہبی اجارہ داریاں ہوں گی اور نہ مذہب کے نام پر کمائی کی کوئی سبیل' نہ ہر فرقے کی الگ الگ مسجد ہوگی (کیونکہ فرقے ہی نہیں ہوں گے۔ پھر یاد رکھئے فرقہ بندی شرک ہے (30:31-32) اور شرک ظلم عظیم (31:13) مشرک اور ظالم فلاح نہیں پاسکتے (6:135)۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں ہی کامیاب ہوسکتے ہیں) فرقہ پرستی سے مساجد میں دنگا فساد ہوتا ہے جس کی وجہ سے مساجد میں تقسیم اور تالہ بندی' یہاں تک کہ کلاشنکوفوں کے برسٹ اور بم دھماکے اور قتل تک ہو جاتے ہیں۔ یہ سب انہی فرقہ پرست اور فتوہ گر خطیبوں کا کیا دھرا ہے۔ سادہ لوح عوام اللہ اور رسولؐ کی محبت کی وجہ سے جذباتی ہو کر ان کی بھڑکائی ہوئی آگ میں کود پڑتے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس سارے فساد کا نام جہاد رکھا جاتا ہے۔

انہی فتوہ گر مولویوں میں سے ایک' ایک مسجد کا امام و خطیب ہوتا ہے جبکہ اس کا بیٹا کسی دوسری مسجد کا۔ (یہاں تک کہ یہ ایم پی اے تک بن جاتے ہیں) اور پھر اسی مسجد کے محراب و منبر سے خدا اور رسول ﷺ کی باتوں کی آڑ میں شر اور فساد پھیلاتے ہیں۔

مذکورہ اشتہار کے کرتا دھرتاؤں میں اگر ذرہ برابر بھی حضور خاتم النبین ﷺ سے محبت ہوتی تو پرویزؒ صاحب کو کبھی بھی قادیانیوں کے ساتھ بریکٹ نہ کرتے۔ وہ شخصیت جس کی ساری زندگی کا مقصد حضور ﷺ کی سیرت کی عظمت کو دنیا کے سامنے لانا تھا۔ جس کا صرف ایک مضمون مشہور مقدمہ بہاولپور کے فیصلہ کا سبب بنا جبکہ مذہبی پیشوائیت سال ہا سال تک قادیانیوں سے مناظرے کرتی رہی لیکن ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ یہ صرف "پرویز" ہی تھے جن کی تحریر کی بدولت "قادیانی" غیر مسلم قرار دیئے گئے۔ آج اسی تحریر پر پابندی کا مطالبہ ہے۔

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہئے

جس طرح سرسید احمد خان کے خلاف حجاز مقدس سے کفر کے فتوے منگوائے گئے تھے بالکل اسی طرح آج تحریک طلوع اسلام اور علامہ غلام احمد پرویزؒ کے خلاف سعودی عرب اور کویت کے سرکاری' درباری ملاؤں سے فتوے حاصل کئے جا رہے ہیں۔ (یہ بات یاد رہے کہ کویت نے کوئی سرکاری فتویٰ جاری نہیں کیا)۔ یہ تو خود قرآن سے تہی دامن ہیں۔ خود تنخواہ دار اور ملوکیت کے پروردہ' جن میں اتنی جرات نہیں کہ حجاز مقدس میں جو غیر قرآنی انداز حکمرانی قائم ہے اس کے خلاف آواز تک اٹھائیں۔ ہاں جب اور جہاں قرآن خالص کی آواز بلند ہوئی یہ حضرات فتویٰ صادر کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔

کوئی شخص کسی جگہ کی نسبت سے نہ عالم ہوسکتا ہے' نہ معتبر۔ تکریم کا معیار تقویٰ ہے اور علم و دانش۔ یہی لوگ پاکستانی مولویوں کے رہنما اور مذہبی پیشوا ہوسکتے ہیں کیونکہ انہی کا دیا ہوا وہ کھاتے ہیں اور انہی کے مطلب کا کہتے ہیں۔ جب ان سے قرآن مجید کے دلائل کا جواب نہیں بن پڑتا تو گالیوں اور کافر گری پر اتر آتے ہیں۔ اگر ان میں ذرا بھی دینی حمیت ہے تو تحریک طلوع اسلام اور علامہ غلام احمد پرویزؒ صاحب کے پیش کردہ حقائق کا جواب قرآنی اسناد پر مبنی دلائل کی روشنی میں دیں۔ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ○ (2/111)

وہ کتاب جس کا پہلا ایڈیشن مدّت سے نایاب تھا

مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں

یعنی

تورات — انجیل — وید — رامائن — مہابھارت — بدھ مت

جین مت — مجوسیّت — طاؤازم اور شنٹوازم

کس طرح مرتّب ہوئیں، کن کن مراحل سے گزریں اور آج اُن کی کیا حالت ہے۔ آخر میں بتایا گیا ہے کہ

قرآنِ کریم

کس طرح مرتّب ہوا، اور کیسے محفوظ چلا آرہا ہے!

مذاہبِ عالم کے تقابلی مطالعہ کے لیے بیش بہا معلومات کا ذخیرہ ہے اور مفکرِ قرآن کے وسعتِ مطالعہ کا آئینہ

☆ قیمت: اعلیٰ ایڈیشن =/Rs. 140 قیمت: سٹوڈنٹ ایڈیشن =/Rs. 70

مینجر طلوع اسلام ٹرسٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی محمد چدھڑ

عقیدت کے پھول

بشریٰ رحمان صاحبہ کا شمار ان خواتین میں ہوتا ہے جو ادبی' سیاسی اور سماجی لحاظ سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ روزنامہ نوائے وقت میں "چادر' چار دیواری اور چاندنی" ان کا ایک مستقل کالم ہے۔ "مرکز تجلیات" کے عنوان سے اپنے کالم (مورخہ 99-6-7) میں حضرت شیخ مخدوم علی ہجویری کے متعلق لکھتی ہیں۔

(1) یہ وہ لوگ ہیں جو صدیوں کو صدیوں سے ملاتے ہیں۔ صدیوں کی خبر دیتے ہیں اور صدیوں کے اندر زندہ رہتے ہیں۔

(2) ان اربوں کھربوں انسانوں کو بھی شمار نہیں کیا جا سکتا ہے جو دعا اور دوا کیلئے آئے' جو زیارت کیلئے یہاں آئے' جو رب کا جلوہ دیکھنے کیلئے یہاں آئے۔

(3) یہ عجیب زمین ہے۔ جہاں حضرت داتا گنج بخش۔ فیض عالم محو استراحت ہیں وہ مقام بوسہ گاہ عالم۔ قبلہ اہل صفا اور کعبہ عشاق ہے۔

محبت اور عقیدت کی وارفتگی میں انسان بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ اوپر کے جملوں پر غور فرمائیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بات شیخ علی ہجویری کی قبر کی نہیں بلکہ کسی عبادت گاہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ حضور سرورؐ عالم۔ ہادی دو جہاں ﷺ نے ایسی قبر پرستی سے ان الفاظ میں منع فرمایا کہ "دیکھو! تم میری قبر کو بت مت بنانا اور مشرکوں کی طرح اس کی پرستش نہ کرنا" خود شیخ ہجویریؒ اپنی تصنیف کشف الاسرار میں اپنے متعلق یوں رقم طراز ہیں کہ "اے علی تجھے خلقت گنج بخش کہتی ہے اور تو ایک دانہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتا۔ اس بات کا خیال کہ مخلوق تجھے گنج بخش کہتی ہے ہرگز نہ دل میں لا ورنہ محض دعویٰ اور غرور ہو گا۔ گنج بخش یعنی خزانہ بخشنے والی تو وہی ذات پاک ہے" (کشف المحجوب ص 4) اگر یہ درست ہے اور بظاہر غلط ہونے کا کوئی جواز نہیں تو پھر مبالغہ خواہ تحریر میں ہو یا تقریر میں بہر صورت اصلیت سے دور لے جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ تم دین میں غلو (مبالغہ) مت کرو" (5:77) مزید برآں بت پرستی بھی عقیدت کے اظہار کی ہی ایک شکل ہے۔ جس میں لوگ پتھروں کو تراش کر بت بناتے ہیں۔ انہیں بنا سنوار کر پرستش گاہ میں سجاتے ہیں اور پھر انہیں بتوں کے سامنے اپنی حاجات کا دامن پھیلا دیتے ہیں۔ ہم مروجہ اسلام کے پیروکار غیر مسلموں کو بت پرست اور مشرک کہتے ہیں۔ لیکن تھوڑے بہت فرق کیساتھ خود بھی وہی کچھ کرتے ہیں جس کی بناء پر غیر مسلم مشرک اور بت پرست کہلاتے ہیں۔ مثلاً ہمارا ایک مذہبی بزرگ جب فوت ہو جاتا ہے تو غسل کے بعد کفن پہنا کر اس کی بخشش کے لئے دعا کرتے ہیں۔ وہ خود چل کر قبر تک بھی نہیں جا سکتا۔ اس کی تدفین کی ذمہ داری بھی ہمیں پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے فارغ ہو کر قبر پر ایک عالیشان گنبد نما عمارت مکمل کرتے ہیں اور پھر اسی بزرگ سے مرادیں مانگنے لگ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ان لوگوں کی یہ حالت ہے کہ زندہ انسانوں ہی سے نہیں بلکہ مردوں تک سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں ان مردوں سے جنہیں اور باتوں کا علم تو ایک طرف خود اپنے متعلق اتنا بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے" (16:21) خیر دوسروں کی دیکھا

دیکھی وہی قبر مزار اور مزار سے دربار بن جاتی ہے اور ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے کہ اس قبر سے ہمیں رب کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے اور یوں وہ جلد ہی مرکز تجلیات بن جاتی ہے۔ یقین کریں کہ اس طرح وہی قبر بوسہ گاہ عالم' قبلہ اہل صفا اور کعبہ عشاق کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ متولی لوگ صاحب قبر کی کرامات وضع کر کے اسے القاب عطا کر دیتے ہیں۔ مثال اس کی یوں سمجھیں کہ یہ جو پتھر کے بت ہیں۔ حقیقتاً پتھر ہی ہوتے ہیں لیکن جب انہیں نئی ہیئت اور نام مل جائیں تو لات و منات بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان ناموں کی حقیقت اور اصلیت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ "ان کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے۔ محض اتنی ہی کہ یہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں۔ ورنہ ان کی اپنی کوئی حقیقت اور پوزیشن نہیں۔ خدا نے ان کے لئے کوئی سند نہیں بھیجی۔ یاد رکھو اختیارات و اقتدارات کا واحد مالک خدا ہے۔ اس کے سوا حکومت کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اس کا فرمان یہ ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اور اطاعت اختیار نہ کی جائے یہ ہے زندگی کا محکم اور استوار نقشہ۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے" (12:40)۔

کالم کے آخر میں محترمہ رقم طراز ہیں کہ "کچھ سال پہلے مجھے ایک جرمن عورت ملی تھی۔ اس نے عارف والہ کے ایک پاکستانی سے شادی کر رکھی تھی۔ وہ عمر میں اپنے شوہر سے بیس برس بڑی تھی۔ اگلے سال وہ پاکستان آئی تو اس نے مجھے ایئرپورٹ سے فون کیا اور کہا کہ وہ پاکستان کی زمین پر اترتے ہی پہلے داتا صاحب کو سلام کرنے جانا چاہتی ہیں۔ میں اسے ایئرپورٹ پر لینے چلی گئی کیونکہ مجھے اسے داتا صاحب کے مزار پر لے جانا تھا۔ میں وہاں پہنچی تو اس کی گود میں تین ماہ کا بیٹا تھا۔ میں حیران ہوئی۔ بولی پچھلے سال میں آئی تھی تو داتا صاحب کے مزار پر منت مانی تھی کہ اس عمر میں ایک بچہ ہو۔ سو یہ بیٹا داتا صاحب کی دعا سے پیدا ہوا۔ میں نے اس کا نام انعام اللہ رکھ دیا ہے۔ یہ داتا صاحب کا انعام ہے۔ میرے لئے۔ پہلے جا کر اس کی چوکھٹ پر پھول چڑھانا چاہتی ہوں"۔

* کتنی بڑی جسارت ہے۔ اس جرمن عورت کی جس نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ (بیٹا) داتا صاحب کا انعام ہے میرے لئے اور کتنا بڑا حوصلہ ہے کالم نویس کا جس نے قرآن کے ہوتے ہوئے اس قسم کے اسلام کی اشاعت کو مناسب سمجھا۔ حالانکہ اس موضوع پر اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر فرما دیا ہے کہ (مفہوم) "کائنات کا تمام نظم و نسق اسی کے قوانین کے تابع چلتا ہے۔ حتیٰ کہ انسان کی طبیعی زندگی بھی اس کے قوانین کے احاطہ سے باہر نہیں۔ اس کے قوانین کے مطابق تخلیق کا یہ محیرالعقول سلسلہ جاری ہے۔ اس میں خود انسانی تخلیق بھی شامل ہے۔ جس کی رو سے کسی کے ہاں صرف لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور کسی کے ہاں صرف لڑکے" (42:49)

"کسی کے ہاں لڑکیاں اور لڑکے دونوں اور کسی کے ہاں اولاد ہی نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد علم خداوندی پر ہے" (42:50)

غور فرمایا آپ نے یہ سب کچھ خدا کے ان مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ جو کسی بڑے سے بڑے مذہبی بزرگ' ولی یا یہاں تک کہ کسی نبی کی خواہش پر بھی بدل نہیں سکتے۔ رہا یہ سوال کہ بیٹا داتا صاحب کی دعا سے پیدا ہوا تو اس کے لئے بھی لازماً پہلے داتا صاحب کو پکارنا پڑے گا۔ یاد رکھیں ایسے تمام عقائد گمراہ کن اور غیر قرآنی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہے جو اللہ کو چھوڑ کر انہیں پکارتا ہے جو اپنے پکارنے والوں کی پکار کو سن ہی نہیں سکتے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ پکارنا اسے چاہئے جو پکار کو سن بھی لے اور اس کا جواب بھی دے سکے۔ فرمایا "(جب اے رسولؐ) تجھ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو ان سے کہدو کہ میں ان سے قریب ہوں۔ اتنا قریب کہ میں ہر اس شخص کی پکار کا جو مجھے پکارتا ہے۔ جواب دیتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ انہیں چاہئے کہ میری فرماں برداری اختیار کریں۔ مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ انہیں رشد و ہدایت مل جائے" (2:186)۔

دیکھنا اب یہ ہے کہ اس فرمان خداوندی کے بعد انسانی حاجت روائی کیلئے کسی غیر الٰہی واسطہ۔ ذریعہ یا وسیلہ کا کوئی جواز کہاں

تک رہتا ہے۔ سچ پوچھیں تو ایسی ہی توہم پرستی کی زنجیروں کو توڑنے کیلئے تو ہمارے رسولؐ آئے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم اپنی خود ساختہ زنجیروں کو تقدس کا درجہ دیکر مڑ مڑ کر گلے لگا رہے ہیں۔ بقول شاعر:

اپنے پھیلائے ہوئے جال سے نکلیں کیسے
اس خود ساختہ زنداں میں ہے مسکن اپنا

خواہشات و جذبات کی اس دنیا میں بیٹے کی تمنا کسے نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر بھی اس خواہش سے خالی نہیں ہوتے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہماری راہنمائی کیلئے حضرت ابراہیم کی بڑی عمدہ مثال موجود ہے۔ جب خدا کے فرستگان نے حضرت ابراہیم کو بیٹے کی خوش خبری دی تو "اس پر حضرت ابراہیم کی بیوی نے کہا کہ یہ تو بڑی تعجب انگیز اور میرے لئے معجوب کن--- بات ہوئی کہ میرے ہاں اس عمر میں جبکہ میں اس قدر سن رسیدہ ہو چکی ہوں اور یہ کہ میرے خاوند بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان حالات میں اولاد کا ہونا حیرت انگیز سی بات ہے" (11:72)

"اس پر انہوں نے (خدا کے فرستگان نے) کہا کہ تم اللہ کے کاموں میں تعجب کیوں کرتی ہو۔ اے اہل خانہ! یہ تو تمہارے لئے رحمت اور برکت کی خوشخبریاں ہیں۔ اس کی رحمتوں سے ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر سزاوار حمد و ستائش اور کس قدر فراوانیاں عطا کرنے والا ہے"۔ (11:73)

اسی سلسلہ میں دوسری مثال حضرت ذکریا علیہ السلام کی ہے۔ جب وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی بیوی بانجھ تھی اور بیٹے کی تمنا تھی۔ اپنے رب کو خاموشی سے پکارا اور کہا کہ "اے میرے پروردگار! میں بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہوتا چلا جا رہا ہوں۔ میرے سر کے بال بالکل سفید ہو گئے ہیں۔ اے میرے رب۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے تجھ سے کچھ مانگا ہو اور تو نے نہ دیا ہو" (19:4)_ ارشاد باری ہے (ہم نے اس کی دعا سن لی اور کہا) "اے ذکریا! ہم تمہیں ایک بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری دیتے ہیں۔ جب وہ لڑکا پیدا ہو تو اس کا نام یحیٰی رکھنا۔ یہ ایک لڑکا ہو گا۔ جس کی نظیر (تمہارے خاندان میں نہیں ملے گی)" (19:7)_ اور یہ بھی فرمایا کہ تیرے پروردگار کا ارشاد ہے کہ بڑھاپے میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کا بیدار ہو جانا ہمارے قانون کی رو سے ہے۔ ہمارے جس قانون نے اس سے پہلے خود تجھے پیدا کیا حالانکہ تیری ہستی کا نام و نشان بھی نہیں تھا" (19:9) چنانچہ اس خوشخبری کے مطابق یحیٰی کی پیدائش ہوئی۔

بہرحال انسانی خواہش کے اظہار اور اس کی تکمیل کیلئے یہ وحی کی راہ نمائی ہے جسے خدا نے ہمارے لئے کتاب اللہ میں محفوظ کر دیا ہے۔ جیسا کہ آیات مقدسہ سے ظاہر ہے۔ یہاں خدا اور بندے کا براہ راست معاملہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ذریعہ اور کوئی وسیلہ موجود نہیں۔ بندہ اپنے خدا کو پکار رہا ہے اور وہ اس کی پکار پر عطاؤں کے در کھول رہا ہے۔ کتنی سادہ اور آسان ہے خدا کی اس راہ نمائی کی کرم فرمائی۔ نہ کسی انسان کی محتاجی۔ نہ کسی کے نام کی منت۔ نہ کسی مقرب کی سفارش اور نہ کسی صاحب مزار کی قدم بوسی۔ یہ انسانی تکریم کی انتہا ہے کہ اسے غیر از خدا تمام توقعات سے بے نیاز کر دیا ہے۔ نہ مانگنے پر پابندی۔ نہ دینے پر کوئی قدغن۔ کسی نے ایسا داتا کہاں دیکھا ہو گا جسے ہماری ضروریات سے بھی آگاہی حاصل ہے۔ فرمایا "جو کچھ تجھے مانگنا ہے اس خدائے رحمٰن سے مانگ۔ جو جانتا ہے کہ کس شے کو نشوونما کیلئے کس کس سامان کی ضرورت ہے" (35:59)

لیکن کیا کیا جائے کہ یہ عقیدہ ہمارے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ کہ خدا سے کوئی براہ راست نہیں مانگ سکتا۔ اس سے مانگنے کیلئے کوئی ایک آدھ وسیلہ نہایت ضروری ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ بھی کسی گورنر کی کرسی پر بیٹھا ہے۔ جسے ملنے کیلئے پہلے اس کے پی۔ اے یا سیکرٹری سے ملاقات کا اہتمام لازمی ہے۔ بہرحال جو خدا سفید بالوں کیساتھ بوڑھے میاں بیوی کو بغیر کسی سفارش کے اسحٰق اور یحیٰی جیسے فرزند عطا کر سکتا ہے۔ اس کے لئے جرمن عورت کو عمر میں کچھ تفاوت کے باوجود بیٹا عطا کرنا کوئی مشکل نہیں۔ اس میں حیرانی اور اچنبھے کی کونسی بات ہے۔

(اشتہار)

طالبان قرآن کے لئے خوشخبری 3500 صفحات پر مشتمل قرآن پاک کی

عظیم الشان تفسیر

بیان للناس

"قرآن مجید کی بیشمار تفاسیر کے ہوتے ہوئے بظاہر کسی نئی تفسیر کی ضرورت نہ تھی، لیکن ذرا تامل کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عموماً ہر تفسیر تفسیر قرآن ہونے کی بجائے کسی خاص فرقہ کے خیالات اور معتقدات کی تفسیر ہے۔ ہر مصنف نے آیات قرآنیہ کو اپنے ہی مذہب کے آئمہ کی نظر سے دیکھنے کی سعی کی ہے (الاماشاء اللہ) قرآن کو (کہ قول الٰہی ہے) آیات قرآنی اور صحیفہ فطرت (کہ فعل الٰہی ہے) کی مدد سے سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا کسی تصنیف کو اس کے مصنف کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنا۔ بس یہی ضرورت تھی جو محرک ہوئی تفسیر پیش نظر کے وجود میں آنے کی۔ قدما میں بھی خال خال ایسے لوگ نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنے ماحول کے لحاظ سے نہایت قابل قدر تفسیریں لکھیں چونکہ قرآن ایک مخصوص ماحول کا پابند نہیں، کسی خاص فرقہ کے خیالات کا آئینہ دار نہیں، کسی متعین زمانہ اور محدود ملک کی ضرورتوں کا متکفل نہیں اس لئے ضرورت تھی کہ عصر حاضر تک کی ترقی علوم و تجارت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا ایک عمیق مطالعہ تمام کائنات انسانی کے سامنے پیش کیا جائے۔ پس اس تفسیر میں یہ پانچ خصوصیتیں ہیں جو اس کو عام تفاسیر سے ممتاز کرتی ہیں۔

1- اس کے مخاطب بلا لحاظ فرقہ و مذہب تمام انسان ہیں جیسا کہ قرآن کا اپنا شیوہ ہے۔

2- اس میں حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ کوئی بات عقل سلیم کے خلاف نہ ہو۔

3- ترجمہ میں سب سے پہلے اصول عربیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

4- اس کے بعد عام منشائے قرآن کا تتبع ہے جو محکمات سے واضح ہے۔

5- اس کے ساتھ ہی سنت اللہ یعنی نیچر کے قوانین کا احترام کیا گیا ہے"

طلوع اسلام کے کنونشن پر خصوصی رعایت

دوست ایسوسی ایٹس

پبلشرز۔ بک سیلرز اینڈ جنرل آرڈر سپلائرز

الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 7122981

email: shahid.adil@usa.net

مکمل سیٹ =/2000 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خورشید ندیم

اہل مذہب کی خدمت میں

مالک ابن انس سے کون واقف نہیں۔ آپ امام دارالھجرہ اور جلیل القدر فقیہ تھے۔ امت جن شخصیات کے علمی احسانات کی ہمیشہ معترف رہے گی وہ ان میں سے ایک ہیں۔ لیث بن سعد بھی اہل علم کے لئے اجنبی نہیں۔ امام مالک کے ہمعصر، مصر کے جید عالم اور فقیہ۔ لیث بن سعد نے بہت سے مسائل میں امام مالک سے اختلاف کیا، جس پر امام نے انہیں ایک خط لکھا۔ لیث نے جواباً جو مکتوب ارسال کیا وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ اس کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے "آپ پر سلامتی ہو۔ تمام حمد و ثناء اللہ تعالیٰ کے لئے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور آپ کو اپنی عافیت میں رکھے اور دنیا و آخرت میں ہمارا انجام بخیر ہو" اس کے بعد انہوں نے مسئلہ زیر بحث کا ذکر کیا۔ اختلاف کی وجوہات بیان کیں اور کئی ایسے مسائل کا حوالہ دیا جن میں وہ امام مالک سے مختلف رائے رکھتے تھے پھر آخر میں لکھا "اللہ تعالیٰ آپ کو خیر و عافیت سے رکھے۔ آپ کی زندگی میں برکت ہو کہ اس میں عامتہ الناس کی بھلائی ہے۔ آپ کے چلے جانے میں مسلمانوں کا بہت زیاں ہے۔ آپ سے دور ہوتے ہوئے بھی میں آپ کی قدر و منزلت سے آگاہ ہوں۔ میری ضرورت ہو تو مجھے ضرور آگاہ کیجئے۔ مجھے خوشی ہو گی"۔

یہ مکتوب اس بات کا مظہر ہے کہ مسلمان اہل علم کس طرح ایک دوسرے کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اختلاف کرتے تھے۔ یہ مسلمان اہل علم کا اختلاف ہی ہے جس نے اس عظیم الشان علمی روایت کو جنم دیا جس پر ہم آج ناز کرتے ہیں اور اقوام عالم میں اسے اپنا امتیازی وصف سمجھتے ہیں۔ تاریخ میں احترام کے ساتھ اختلاف کے اتنے واقعات بیان ہوئے ہیں کہ ان پر مشتمل کئی کتابیں ترتیب دی جا سکتی ہیں۔ یہ اختلاف شدید بھی ہوا اور انسانی نفسیات کے عین مطابق بعض اوقات اس میں تلخی اور غصہ بھی در آیا، جیسے ایک مرتبہ امام شافعی اور امام محمد بن حسن کے مابین ہوا، امام شافعی بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میرے اور محمد بن حسن کے درمیان علمی گفتگو ہوئی، "بات بڑھتے بڑھتے شدید اختلاف میں ڈھل گئی۔ مجھے خیال ہوا کہ غصے سے ان کی رگیں پھٹ جائیں گی اور بٹن ٹوٹ جائیں گے" یہی امام محمد جب امام شافعی کے بارے میں کلام کرتے ہیں تو کہتے ہیں "اگر کسی کی رائے ہمارے مقابلے میں درست ثابت ہوئی تو وہ شافعی ہیں"۔ ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا "اس کا سبب ان کا حسن بیان ہے اور یہ بھی کہ وہ غور سے سنتے اور پورے اعتماد کے ساتھ سوال و جواب کرتے ہیں"۔

بدقسمتی سے اس امت میں جہاں اسلاف کے علمی وارث بہت کم پیدا ہوئے وہاں اختلاف کے وہ آداب بھی باقی نہیں رہے جن کو ہم تذکروں میں لکھا دیکھتے ہیں۔ آج لوگوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے حاملین کو منظم کر رکھا ہے اور وہ اختلاف کرنے والوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ دینی مدارس اور اداروں میں طلباء کو تقلید میں پختہ تر تو کیا ہی جاتا ہے، عدم رواداری کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ آج ہر مذہبی گروہ دوسرے گروہ کو فتنہ سمجھتا اور اسے امت سے خارج

کرنا اپنا بنیادی فریضہ خیال کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے نزدیک عزیمت کا راستہ یہ ہے کہ ایسے ہر فرد اور گروہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے جو اختلاف کی جرات کرتا ہے۔ اس رویئے نے ہمارے معاشرے کو جس فساد میں مبتلا کر دیا ہے ہم اس کے مظاہر آئے دن دیکھتے ہیں۔

اہل مذہب کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ ان کا کام دین بیان کرنا اور لوگوں کو آخرت کے عذاب سے بچنے کے لئے متنبہ کرنا ہے اگر ان کے نزدیک کوئی فرد یا گروہ دین کی غلط تعبیر کر رہا ہے تو ان کی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے فہم کے مطابق دین کو صحیح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کر دیں۔ اختلاف رائے کی بنیاد پر اپنے گروہ کے لوگوں کو دوسروں کے خلاف بھڑکانا اور انہیں یہ تربیت دینا کہ وہ مخالف کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں ایک ایسا رویہ ہے جس کے لئے قرآن و سنت میں کوئی دلیل موجود نہیں اور جس سے ہمارے اسلاف کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ رویہ حکمت کے خلاف بھی ہے۔ جب ایک نقطہ نظر چند علمی اساسات کے ساتھ سامنے آتا ہے تو اس کا سامنا کرنے کا درست طریقہ یہی ہے کہ اس کے علمی رعب کو ختم کر دیا جائے اور یہ کام علمی غلطی کو واضح کرنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے اچھی مثال غلام احمد صاحب پرویز کی ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ غلام احمد پرویز اب ایک قصہ پارینہ ہیں ان کی تحریک ان کے ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ان کی قائم کردہ آراء پر نقد کر کے علماء نے ان کی غلطی اس طرح واضح کر دی کہ اس کے فروغ کے تمام امکانات ختم ہو گئے۔ آج ملک میں ان کے جتنے نام لیوا ہیں اس سے کہیں زیادہ مرید اس پیر کے ہوں گے جو کہیں مضافات میں انسانی آبادیوں سے دور، کسی بے نام قبر پر مجاور بنا بیٹھا ہے۔ چند روز پہلے اخبارات میں ایک اشتہار شائع ہوا جس میں بعض مذہبی تنظیموں کی طرف سے غلام احمد پرویز اور ان کے معتقدین کو کافر قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ میرے نزدیک یہ ایک فکری گمراہی کو پھر سے زندہ کرنے کے مترادف اور خلاف حکمت ہے۔

اہل مذہب کی خدمت میں میری گذارش یہ ہے کہ وہ اپنے اپنے گروہوں میں مذہبی رواداری پیدا کریں ان میں اس بات کا شعور پیدا کریں کہ اختلاف رائے کے ساتھ کیسے رہا جاتا ہے اور اس حوالے سے ہمارے اسلاف کی روایات کیا رہی ہیں۔ وہ اپنی تمام توجہ علمی تحقیق اور دعوت و تبلیغ پر دیں۔ وہ اس بات کا بھی اہتمام کریں کہ دینی مدارس سے فارغ التحصیل علمی طور پر مضبوط تو ہوں ہی، ساتھ ہی اس اخلاق و کردار کا بھی نمونہ ہوں جو ہمارے اسلاف کی روایت ہے۔ ان میں اختلاف رائے برداشت کرنے کا حوصلہ ہو اور وہ مہذب انداز میں اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کا سلیقہ رکھتے ہوں۔ یہ بات ارباب حل و عقد کے غور کرنے کی بھی ہے کہ ہمارے معاشرے میں مذہب کے نام پر جو انتہا پسندی اور تنگ نظری فروغ پا رہی ہے اس کے اسباب کیا ہیں اور ان سے کس طرح بچا جا سکتا ہے۔

(روزنامہ جنگ 6 ستمبر 1999ء)

طلوع اسلام:- خورشید ندیم صاحب کے اس کالم کے ضمن میں ہمیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہنا کہ وہ پرویز صاحب کے عمر بھر کے علمی و تحقیقی کاوشوں کے مقصد وحید کو مکمل طور پر سمجھ نہیں پائے۔ پرویز صاحب نے ساری زندگی قوم کو شخصیت پرستی کے جال سے نکالنے اور قرآن کو عام کرنے میں صرف کی۔ اپنے اس نصب العین میں وہ اس حد تک راسخ تھے کہ انہوں نے اپنی ذات کو کبھی خود اہمیت دی اور نہ ہی ان سے کسب ضیاء کرنے والے انہیں ایک استاد اور مفکر قرآن سے زیادہ کچھ اہمیت دیتے ہیں۔ انہوں نے کم و بیش اپنی ہر کتاب میں یہ بات دہرائی ہے کہ

"میں نہ اپنی بصیرت کو سہو و خطا سے منزہ سمجھتا ہوں، نہ اپنے فہم قرآن کو حرف آخر۔ میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں۔ اس سے زیادہ، نہ میرا کوئی دعویٰ ہے نہ مقام"۔ (شاہکار رسالت۔ گذر گاہ خیال) "اگر میری کوشش سے ایک سوچنے

میری محنت ثمر بار ہو گئی اور مجھے میری دیدہ ریزیوں اور جگر کاویوں کا صلہ مل گیا"۔ (تعارف مفہوم القرآن)۔

اپنے اسی مشن کے متعلق جس کا ذکر اوپر ہوا ہے' انہوں نے کئی جگہوں پر بڑی وضاحت سے لکھا ہے لیکن تبویب القرآن کے صفحہ نمبر 16 پر یہ امر بڑی عمدگی اور جامعیت سے سامنے آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"اور آخر میں جھکی ہوئی نگاہوں سے' وہ اعتراف جس پر میں اپنی ہر فکری تخلیق کو ختم کیا کرتا ہوں۔ میں نے فکر قرآنی کے سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے وہ بہرحال ایک انسانی کوشش ہے۔ جسے نہ سہو و خطا سے منزہ کہا جا سکتا ہے نہ حرف آخر۔ اس میں جو کچھ صحیح ہے وہ صدقہ ہے خدا کی اس کتاب عظیم کا جس میں حق و صداقت کے سوا کچھ نہیں اور جو سہو ہے وہ نتیجہ ہے میری کوتاہی فہم کا۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

اس سہو و خطا کے لئے میں اس درخواست کے ساتھ بحضور رب العزت خواستگار عفو ہوں کہ:

گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردہ ناموس فکرم چاک کن
ایں بیاباں را ز خارم پاک کن

اس کے برعکس

گر در اسرار قرآں سفتہ ام
با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آب نیسانم' گہر گرداں مرا

(تبویب القرآن' صفحہ نمبر 16)

طلوع اسلام بھی اسی مشن کے لئے سرگرم عمل ہے۔ اس کے نزدیک شخصیات کا چرچا کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہمیں خوشی اس بات کی ہے کہ پرویز صاحب نے قرآن کو جزدانوں سے نکال کر عام آدمی کو اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی راہ سمجھائی۔ آج جو ہر دوسرا مدرسہ' مکتب یا ادارہ قرآن کو اپنے نام کا حصہ بنانے پر مجبور ہوا ہے تو یہ اسی مرد راہ دان کی کاوشوں اور کوششوں کا تصدق ہے۔ پرویز صاحب کی فکر کا سرچشمہ قرآن ہے اس لئے کوئی لاکھ چاہے اسے قصہ پارینہ بنا نہیں سکتا۔

پیپلز کلیرنگ ایجنسی
کسٹم ہاؤس سے منظور شدہ
کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنٹ
۲۵ سالہ تجربہ کار
کلیرنگ اور فارورڈنگ کے معاملات میں ایک قدم آگے
ہمارے ۲۵ سالہ تجربہ سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ فائدہ۔
ہم آپکی خدمت کیلئے ہمہ وقت تیار ہیں۔
۵۔ وقار سینٹر، فرسٹ فلور رام بھارتی اسٹریٹ، جوڑیا بازار۔ کراچی
فون: ۲۴۲۶۱۲۸ ۲۴۳۱۰۴۵-۲۴۳۷۸۳۷
فیکس نمبر:- ۲۴۱۹۷۸۲
ٹیلیکس:- ۲۱۰۴۳ BTC PK

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقائق و عبر

اہل حدیث اور حنفی

فرقہ اہل حدیث اور حنفیوں کے درمیان اختلافات کس نوعیت کے ہیں' ان کی جھلک دیکھنے کیلئے اس فرقہ کے ایک ترجمان ہفت روزہ ترجمان دہلی سے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ مدیر مسئول

(1) "اسلامی آئین کے مطابق رسول اکرم ﷺ جس کام کا حکم فرمائیں وہ تمام مسلمانوں کے نزدیک لازمی اور فرض ہو جاتا ہے چنانچہ آپ کے مذکورہ بالا حکم پر تمام صحابہ کرامؓ نے عمل کیا تابعین و تبع تابعین نے اسے اپنا دستور العمل بنا لیا' اور اسلامی تاریخ کے ابتدائی تین سو سالوں تک متفقہ طور پر اس پر عمل ہوتا رہا لیکن چوتھی صدی ہجری میں جب تقلید کی ناجائز ولادت ہوئی اس نے اپنے پر پرزے نکالے اور آگے اس کی ناجائز اولاد کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے حکم رسالت مآب ﷺ کی دھجیاں بکھیرنی شروع کر دیں اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

گذشتہ صفحات میں بھی آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اللہ کے رسول ﷺ جس بات کا حکم دے رہے ہیں تقلید کے متوالے اسے ٹھکرا رہے ہیں۔ اسی طرح آپ نے ابھی پڑھا کہ سرور دوعالم ﷺ عورتوں کو عیدگاہ لے جانے کی تاکید فرما رہے ہیں لیکن فقہ حنفی میں بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ اسے مکروہ اور ناجائز بتایا جا رہا ہے اور سارے مقلدین احناف حکم رسول کو نظرانداز کر کے فقہ حنفی پر اپنا عقیدہ استوار کر رہے ہیں"۔

(جریدہ ترجمان دہلی' 2, 9, 16 اپریل 1999ء)

(2) اگر کوئی شخص بیماری کی وجہ سے رمضان شریف کے روزے نہیں رکھ سکا اور اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے جتنے روزے قضا ہوئے ہیں اس کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کا فرمان یہ ہے کہ اس کا ولی یا وارث وہ روزے رکھے چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

من مات و علیه صوم صام عنه ولیه (صحیح بخاری و مسلم' مشکوۃ کتاب الصوم) جو شخص انتقال کر گیا اور اس کے ذمہ فرض روزے رہ گئے تو اس کا ولی اس کی طرف سے قضا کرے۔

لیکن مقلدین حضرات بخاری و مسلم کی اس صحیح ترین حدیث کو نہیں مانتے' ہدایہ کتاب الصوم میں ہے:

الا یصوم عنه الولی میت کی طرف سے اس کا ولی روزہ نہ رکھے۔

اس مسئلہ سے متعلق ایک صحابیہ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے دربار رسالت میں آکر عرض کیا کہ میری بہن کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کے ذمہ دو ماہ کے مسلسل روزے باقی رہ گئے ہیں تو رسول اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ اگر تمہاری بہن کے ذمہ کسی کا قرضہ ہوتا تو تم اس کو ادا کرتیں یا نہیں؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کا حق اس لائق زیادہ ہے کہ تم اسے ادا کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ میت کی طرف سے اس کا ولی یا وارث فوت شدہ روزے رکھے' لیکن مقلدین جن کا وطیرہ ہی حدیث رسول کو ٹھکرانا ہے۔ انکار حدیث سے باز نہیں آتے' حالانکہ مذکورہ واقعہ میں آنحضور ﷺ نے ان صحابیہ کو مثال دیکر مسئلہ اچھی طرح سمجھایا لیکن اس کے باوجود مقلدین اس حدیث کا مفہوم سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں کیونکہ فقہی کتابیں لکھنے والوں نے انہیں سمجھا رکھا ہے کہ تم ایسی حدیثوں کو نظرانداز کر دینا کیونکہ یہ ہمارے تقلیدی مذہب کے خلاف ہیں۔

(جریدہ ترجمان دہلی' 27 نومبر و 4 دسمبر 98ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معزز قارئین

طلوع اسلام

السلام علیکم

اس وقت آپ طلوع اسلام پڑھ رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ آپ برسوں سے طلوع اسلام پڑھتے چلے آرہے ہوں۔ ظاہر ہے کہ آپ اسے اس لئے پڑھتے ہیں کہ آپ کو اس کی پیش کردہ فکر سے اتفاق ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ جس قرآنی نظام کا نقشہ ان صفحات میں پیش ہوتا رہتا ہے۔ وہ جلد سے جلد قائم ہو تاکہ ظلم کا استیصال ہو' عدل عمرانی کا چرچا ہو اور افراد معاشرہ نشوو ارتقاء کے تمام ممکن ذرائع سے متمتع ہو سکیں۔ یہ قدرتی خواہش آپ کے دل میں کئی مرتبہ پیدا ہوئی ہو گی اور آپ نے بڑی بے صبری اور بے چینی سے چاہا ہو گا کہ اس کے حصول کی کوئی صورت نکل آئے۔ اب جب آپ طلوع اسلام پڑھ کر اس فضا میں پہنچے ہیں تو آپ کے دل میں پھر سے ویسے ہی خیالات موجزن ہوں گے۔ آج ذرا طبیعت کے اس رنگ کا فائدہ اٹھایئے اور طلوع اسلام کے مطالعہ سے فارغ ہونے کے بعد یہ نہ کہئے کہ اے کاش ایسا معاشرہ جلد قائم ہو جائے بلکہ ایک عملی آدمی کی حیثیت سے یہ سوچئے کہ ایسا معاشرہ قائم کیسے ہو سکتا ہے اور آپ اس کے قائم کرنے میں کیا مدد دے سکتے ہیں؟

ایک قائم معاشرے کی جگہ نیا معاشرہ اس وقت تک نہیں لے سکتا جب تک کہ افراد معاشرہ حاضر و موجود سے بیزار نہ ہو جائیں اور ان کے دل و دماغ میں بہتر معاشرے کا تصور موجود نہ ہو۔ اس کے بعد ضروری ہوتا ہے کہ وہ تمام افراد جمع ہو جائیں' جو رائج معاشرے سے بے زار ہیں اور اس کے بجائے نیا نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ جوں جوں یہ دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اور لوگ اس میں داخل ہوتے جاتے ہیں' اسی طرح رفتہ رفتہ افراد معاشرہ اس حد تک نئے تصور سے سرشار ہو جاتے ہیں کہ وہ بوسیدہ نظام کو اکھاڑ پھینکتے ہیں اور اس کے کھنڈرات پر نئی منزل کھڑی کر دیتے ہیں۔

اب آپ دیکھئے کہ کیا آپ نے ہم خیال پیدا کرنے اور انہیں ایک رشتہ میں پرونے کا کچھ بندوبست کیا ہے۔ مثلاً" آپ نے اپنا مافی الضمیر کسی کے سامنے پیش کیا' جو پہلے سے اسے نہیں جانتا تھا؟ یا آپ اپنی خلوتوں سے نکل کر اس راہ پر کبھی گئے ہیں' جہاں اور بھی ہم خیال بن سکتے ہیں؟ اگر آپ نے ایسا کر لیا ہے تو آپ نے بیج بو دیا ہے۔ اب اس کی آبیاری کیجئے اور دیکھئے کہ اس بیج کی کونپل پھوٹے اور بالاخر وہ شجر طیب بن کر رہے۔ جس کی جڑیں پاتال تک پہنچ جاتی ہیں اور شاخیں آسمانوں سے باتیں کرتی ہیں۔ اس درخت کا استیصال امر محال ہو جاتا ہے۔

اگر آپ نے ابھی ایسا نہیں کیا' تو آیئے اٹھ کر ذرا آس پاس دیکھئے۔ کتنے لوگ ایسے ہیں' جو آپ ہی کی طرح طلوع اسلام پڑھتے چلے آتے ہیں اور سینوں میں آپ ہی کی طرح خواہشات دبائے پھرتے ہیں۔ یہ آپ کے معاونین اور رفقائے کار ہیں۔ ان سے رابطہ پیدا کیجئے۔

کبھی مل بیٹھئے اور تبادلہ خیالات کیجئے۔ رفتہ رفتہ آپ محسوس کریں گے کہ اس سے پیشتر کبھی کبھی آپ پر تنہائی اور یاس کے جو احساسات غالب آجایا کرتے تھے۔ وہ اب کافور ہوتے جا رہے ہیں اور آپ میں مقصد کے حصول کے لئے ایک ولولہ عمل بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کے رفقاء بھی ایسے ہی محسوس کر رہے ہیں۔ اس فضا میں آپ دیکھئے گا کہ کام ہونا شروع ہو جائے گا۔ آپ اس راہ پر ایک مرتبہ چل دیجئے۔ پھر آپ کا ہر قدم آپ کو منزل سے قریب تر کرتا جائے گا۔ اگر آپ کو ہم خیال تلاش کرنے میں دقت ہو تو ہمیں اطلاع دیجئے۔ ہم آپ کا نام طلوع اسلام میں شائع کر دیں گے۔ اس پر مقامی قارئین آپ سے رابطہ پیدا کر لیں گے۔ ہم نے خریداروں کی قصبہ وار فہرست بھی تیار کر لی ہے۔ آپ چاہیں تو اس میں سے ہم آپ کے شہر کے خریداروں کا نام دے سکتے ہیں۔

آپ اور آپ کے رفقائے کار مل بیٹھیں' تو اس اجتماع کو "بزم طلوع اسلام" کا نام دیجئے۔ اس کی تحویل میں ایک لائبریری قائم کیجئے' جو طلوع اسلام اور اس کی مطبوعات کو ان تک پہنچانے کا ذریعہ ہو۔ جو اب تک ان سے بے خبر رہے۔ یا جو انہیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس طرح آپ کا مرکز بن جائے گا تو پھر آپ کے پاس ایک طرف ایسے لوگ آئیں گے جو آپ کی تحریک سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں گے۔ ان کی پوری تشفی کیجئے۔ طلوع اسلام کے فکر سے قدرے اجنبی ہونے کی حیثیت سے ضرورت ہو گی کہ انہیں مناسب طریق سے اس فکر سے متعارف کرا دیا جائے۔ آپ یہ فریضہ انجام دیجئے۔ اس میں آپ کو' اور رفقائے کار مل جائیں گے۔ دوسری طرف آپ کے پاس بعض ایسے حضرات بھی آئیں گے' جو خواہ مخواہ کی حجت پیدا کریں گے اور کام میں رخنے ڈالیں گے۔ ان کے اعتراضات کا پورا پورا جواب دیجئے لیکن ان سے زیادہ مت الجھئے کیونکہ انہیں کام سے سروکار نہیں۔ ان میں نہ کام کرنے کی صلاحیت ہے۔ نہ وہ کسی کو کام کرنے ہی دیتے ہیں۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

تاریخی یادداشتیں

سوال یہ ہے کہ قرآن کا دین موجودہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا؟ غیر قرآنی نظریات' تصورات' معتقدات کہاں کہاں اور کن کن راستوں سے در آئے؟ دانشور حضرات اس موضوع پر روشنی ڈال سکیں تو راقم ممنون ہو گا۔

ملتمس : ایم-آر راجہ (کینیڈا) معرفت ادارہ طلوع اسلام' 25 ٹی گلبرگ 2' لاہور

سالانہ کنونشن 1999ء

چند اہم وجوہات کی بناء پر طلوع اسلام کنونشن 1999ء کے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی ناگزیر ہو گئی ہے۔ 17 اکتوبر کو ہونے والا سیمینار "بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن" ملتوی کر دیا گیا ہے۔ پروگرام اب 16 اکتوبر کی صبح 10 بجے شروع ہو گا اور 17 اکتوبر کی شام کو ختم ہو جائے گا۔

کنونشن کے دیگر مجوزہ پروگرام کی تفصیل بزمہائے طلوع اسلام کو قبل ازیں جاری کی جا چکی ہے۔ شرکت کے خواہش مند خواتین و حضرات اپنی قریبی بزم یا ادارہ طلوع اسلام سے براہ راست رابطہ فرمائیں۔

پروگرام میں شرکت کے لئے نمائندہ بزم کی اجازت ازبس ضروری ہے

(چیئرمین ادارہ طلوع اسلام)

For All Publications of Allama Parwez and recorded lectures on Quran

Please contact:

TOLU-E-ISLAM TRUST

25-B, Gulberg 2 Lahore-Pakistan.

Phone: 5753666 - 5764484
Fax: 092-42-5764484
Email: trust@toluislam.com
Internet: http://www.toluislam.com

Current Account No
4107-35
Main Gulberg Branch
Habib Bank Limited
Lahore

سانحہ ارتحال

ساؤتھ اینڈ اون سی (Southend-On-Sea) کے نمائندہ بزم محمد اعظم راجہ صاحب پچھلے ہفتہ حرکت قلب بند ہونے سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم چند سالوں سے عارضہ قلب میں مبتلا تھے اور ان کا بائی پاس اپریشن بھی ہو چکا تھا۔ ان کے دم خم سے بزم قائم تھی۔ مرحوم 50 سال سے تحریک طلوع اسلام سے وابستہ تھے 1956ء تا 1960ء وہ جہلم بزم کے سرگرم و سرکردہ ممبر تھے۔ وہ بڑے اہتمام سے 60 کلو میٹر سے لندن بزم کے اجلاس میں شرکت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے سحاب کرم میں رکھے۔

بزم طلوع اسلام ملتان کے اہم رکن محترم چوہدری انوار الحق بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ مرحوم بزم ملتان کے روح رواں تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ادارہ مرحوم کے لواحقین و اعزہ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

رپورٹ بزم طلوع اسلام مینگورہ، سوات

بزم طلوع اسلام مینگورہ، سوات نے 7 ستمبر 1999ء کو "یوم ختم نبوت" کے طور پر منانے کا پروگرام بنا کر سوات کے معززین، طالبعلموں اور صاحب فکر لوگوں تک دعوت نامے بھجوا دیے۔ اس پروگرام کی اہمیت کے پیش نظر اس کے شایان شان اہتمام کیا گیا۔ جوں جوں مقررہ تاریخ قریب آ رہی تھی لوگوں کا ذوق و شوق اور ختم نبوت کی اہمیت سمجھنے والوں کا بزم کے دفتر سے رابطہ تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ ستمبر کے آغاز ہی سے نہ جانے کیوں مقامی مذہبی پیشوائیت کی ختم نبوت پروگرام کے خلاف سرگرمیاں دھمکیوں تک آ گئیں۔ اس پروگرام کو روکنے کے لئے اولاً تقاریر و تحاریر کا سہارا لیا گیا اور بعد ازاں نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر طرف بینرز اور پوسٹر لگا دیے گئے۔ عوام کو گمراہ کرنے کے لیے ہر ممکن الزام تراشی کی گئی۔

انتظامیہ پر بھی دباؤ شدید سے شدید تر کر دیا گیا اور امن و امان کا مسئلہ پیدا کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ ختم نبوت کے سلسلہ میں ہونے والے اس پروگرام کی پوری تفصیل بھی جاری کر دی گئی تھی۔ نوجوان نسل کے لئے اس مسئلہ کی اہمیت بالخصوص مسلمہ تھی مگر اس پروگرام کی راہ میں روڑے اٹکا کر اللہ کی راہ پر بلانے والوں نے اللہ کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہونے والوں کا کردار ادا کیا۔ ان تمام مشکلات کے علی الرغم محترم اقبال ادریس نمائندہ بزم طلوع اسلام نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نہایت استقامت کے ساتھ پروگرام جاری رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وائے حسرتا! انتظامیہ نے بھی مذہبی پیشوائیت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور بزم طلوع اسلام سوات کے زیر اہتمام تقریب یوم ختم نبوت کے مندوبین کو تحفظ فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔

ادارہ اراکین بزم طلوع اسلام سوات کو عزم و ہمت کی نئی داستانیں رقم کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

پاکستان میں

علامہ غلام احمد پرویزؒ

کا درس قرآن کریم مندرجہ ذیل مقامات پر ہوتا ہے

شہر	مقام	دن	وقت
اسلام آباد	برمکان 302 سٹریٹ 57 - سیکٹر F 11/4	بروز اتوار	ساڑھے 10 بجے صبح
	رابطہ: جناب انعام الحق ملک صاحب فون: 290900		
ایبٹ آباد	234 کے۔ ایل کیہال۔ رابطہ: گل بہار صاحبہ	بروز منگل	4 بجے شام
ایبٹ آباد	234 کے۔ ایل کیہال۔ رابطہ: شیخ صلاح الدین Ph:34699	بدھ	4 بجے شام
اوکاڑہ	برمکان احمد علی 180-A شادمان کالونی	جمعۃ المبارک	3 بجے شام
	رابطہ: شیخ احسان الحق فون: 520258/520270		
بوریوالا	برمکان محمد اسلم صابر۔ مرضی پورہ گلی نمبر5	پہلا اور تیسرا اتوار	3 بجے دوپہر
	رابطہ: فون: 55438		
بوریوالا	رہائش گاہ ڈاکٹر محمد اسلم نوید فون: 54590	دوسرا اور چوتھا جمعہ	ساڑھے 3 بجے
بہاولپور	ریحان چپل سٹور مچھلی بازار رابطہ: بشیر احمد فون 876785	جمعۃ المبارک	2 بجے بعد دوپہر
پشاور	دفتر جناب عبداللہ ثانی صاحب ایڈووکیٹ۔ کابلی بازار۔	ہر بدھ و جمعہ	5 بجے شام
	رابطہ فون: 840945		
پشاور	اکبر پورہ۔ محلہ گڑھی زرداد	بروز ہفتہ	8 بجے شام
	رابطہ: محترم لیاقت علی طاہر فون: 2990190		
پشاور	برمکان ابن امین فقیر آباد	جمعۃ المبارک	4 بجے شام
پیر محل	مکان نمبر 139/140- مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا اتوار	9 بجے صبح
پنج کسی	برمطب حکیم احمد دین	جمعۃ المبارک	3 بجے شام
جہلم	برمکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد' جی۔ ٹی روڈ	اتوار	9 بجے صبح
جلالپور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	10 بجے صبح
چنیوٹ	مکان نمبر 9/11 ڈبلیو (گنبد والی کوٹھی)	جمعۃ المبارک	چار بجے سہ پہر
	گوجر روڈ' چوک گوجراں' سیٹلائٹ ٹاؤن' چنیوٹ		
چک 215 ای۔ بی	شاہین پٹرولیم' اڈا کوارٹر	اتوار	9 بجے صبح

حیدر آباد	محترم ایاز حسین انصاری B-12' حیدر آباد ٹاؤن' فیز نمبر2 قاسم آباد بالمقابل نسیم نگر -- رابطہ فون۔ 654906	جمعۃ المبارک	بعد نماز عصر
خان پور	بمقام مکان حبیب الرحمان' محلہ نظام آباد' وارڈ نمبر9 خان پور' ضلع رحیم یار خان۔ زبانی درس و تدریس کا سلسلہ	ہر اتوار ہر جمعہ	شام 6 بجے 3 بجے
دائرہ دین پناہ	(تحصیل کوٹ ادو) دفتر نزد P/O رابطہ فون: 480190' درس کے علاوہ لائبریری کھلی رہتی ہے۔	بروز اتوار	11 بجے صبح
راولپنڈی	فرسٹ فلور' کمرہ نمبر114' فیضان پلازہ۔ کمیٹی چوک رابطہ۔ چوہدری نثار احمد۔ فون: 051-74752-542985	جمعۃ المبارک اتوار	4 بجے شام 4 بجے شام
سرگودھا	B-4 گلی نمبر7 بلاک 21 نزد مکی مسجد چاندنی چوک رابطہ: ملک محمد اقبال فون (711233)	منگل	7 بجے شام
فیصل آباد	23- سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل) رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک۔ فون: 720096	ہر جمعۃ المبارک	3.30 بجے شام
کراچی	105- سی بریز پلازہ' شاہراہ فیصل رابطہ کرنل خان ادیب احمد۔ فون: 4550546-4558498	اتوار جمعہ	9 بجے صبح 5 بجے شام
کراچی	ڈبل سٹوری نمبر16 گلشن مارکیٹ' 36/C ایریا کورنگی 5 رابطہ محمد سرور' فون: 312631-5046409 درس کے علاوہ بھی لائبریری کھلی رہتی ہے۔	اتوار بروز جمعہ	11.30 بجے صبح بعد نماز مغرب
کراچی صدر	ہوٹل حبیب ہال۔ عبداللہ ہارون روڈ کراچی رابطہ: محمد اقبال' فون 5892083	اتوار	10 بجے صبح
کراچی لانڈھی	مجاہد ڈیری فارم' پی۔ ایم۔ ٹی۔ ف روڈ۔ لانڈھی رابطہ: آصف جلیل۔ فون نمبر: 5801701	ہر جمعۃ المبارک	3 بجے دوپہر
کراچی	بر رہائش معین الدین' مکان نمبر1070' بالمقابل پراچہ ہسپتال محمد پور' قصبہ اسلامیہ کالونی نمبر1' رابطہ فون 6657224-6666132	ہر اتوار	دوپہر 3 بجے
کوہاٹ	بر مکان شیر محمد' نزد جناح لائبریری	اتوار	8 بجے صبح
کوئٹہ	صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ۔ رابطہ فون: 825736	اتوار	4 بجے شام
گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ' سول لائنز	جمعۃ المبارک	بعد از نماز جمعہ
گجرات	مرزا ہسپتال' کچہری روڈ	جمعرات	
گھوئیکی' سیالکوٹ	بر مکان محمد حسین گھمن	ہر اتوار	

لاہور	25-بی گلبرگ II (نزد مین مارکیٹ)	اتوار	9 بجے صبح
لاڑکانہ	برمکان اللہ بخش شیخ نزد قاسمیہ مسجد محلہ جاڑل شاہ فون 42714	جمعۃ المبارک	بعد نماز عصر
ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ	جمعۃ المبارک	5 بجے شام
مامون کانجن	برمکان ہومیو ڈاکٹر محمد اقبال عامر چک 509 گ ب رابطہ فون: 04610-431345	جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ
منگورہ سوات	ڈیرہ اقبال ادریس، عقب مہران ہوٹل گرین چوک فون: 710917	ہر جمعہ	بعد نماز جمعہ
نواں کلی، صوابی	رابطہ سید الطاف حسین ٹیچر	اتوار	صبح 10 بجے
رانی پور	اوطاق ڈاکٹر سلیم سومرو سومرو محلہ رابطہ شفیع محمد سومرو	جمعۃ المبارک	بعد نماز عشاء
واہ کینٹ	برمکان ایم یعقوب محمود، B-336/5، لین نمبر 7 نزد گرلز ہائی سکول نمبر 8، لالہ رخ، فون: 0596-511621	بروز بدھ	بعد نماز عصر
میانوالی	برمکان حاجی اعظم خان وانڈھی گھنڈ والی فون: 33647	اتوار	صبح 9 بجے
عارف والہ	ڈاکٹر ارشاد احمد دانش، کلینک چک نمبر 117/EB	دوسری، چوتھی جمعرات	بعد نماز عشاء

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی جملہ تصانیف اور ماہنامہ طلوع اسلام کا تازہ شمارہ بھی انہی جگہوں پر دستیاب ہے۔
تحریک طلوع اسلام سے متعلق استفسارات مندرجہ بالا مقامات پر موجود کارکنان تحریک کے حوالہ کیجئے۔ جواب ادارہ سے براہ راست دیا جائیگا۔

(تصحیح اشتہار)

باغبان ایسوسی ایشن کے ریزولیوشن نمبر 20 مورخہ 8-8-99 کے مطابق محترمہ صبینہ یاسمین B.A بی سیداں، جہلم کو سینئر نائب صدر مقرر کرنے کی توثیق کی گئی ہے۔

ملک حنیف وجدانی
صدر باغبان ایسوسی ایشن مری

DARS-E-QURAN

IN FOREIGN COUNTRIES

CANADA	627 The West Mall, Suit-1505 Etobicoke, ONT M9C 4W9 Ph:(416) 245-5322	First Sunday of the Month	1100 Hrs
DENMARK	Mr. M.Afzal Khilji Gammel Kongevej, 47, 3.th, 1610 Kohenhavn V	Last Saturday of the Month	1900 Hrs
NORWAY	Mr. Khadim Malik Lindebergaasen 15B,	First Sunday of Every Month	1500 Hrs
ENGLAND	76, Park Road, Ilford Essex, Ph:0181-553-1896.	First Sunday of the Month	1430 Hrs
ENGLAND	72, Herent Drive Clayhall, Ilford Essex. *Contact:* Mrs. Rubina Khawaja Ph:0181-550-3893 *OR* Mrs. Surraya Farhat Ph:0181-553-1896 (Halqa-e-Khawateen London Bazm)	Last Sunday of the Month	1430 Hrs
ENGLAND	53 Downland Drive, Southgate West, Crawley W.Sussex *Contact:* Mr. M.Khalil-01293-446258 Or Mr. Arshad Mahmood-01293-419784	Every Last Sunday of the Month	2 P.M

Tolu-e-Islam Quoted in High Court

Mr. Justice M.R.Kayani,

Judge West Pakistan High Court, recorded in his judgment (dated 19th September 1957), in the case—Ghulam Bhik v. Hussain Begum—as follows:-

There are four recognized sources of Muhammadan Law, namely (1) the Quran, (2) Hadith (according to some, an interchangeable term with Sunnat), (3) Qias (Reasoning by Analogy) and (4) Ijma' (Consensus of opinion among doctors of religion at a particular time in respect of some particular matter). So far as the Quran goes, I have no intention of interpreting its provisions, which are accepted generally as immutable, though in some details interpreted differently. The real difficulty comes to be faced with Hadith, which reports the Sunnat or practice of the Prophet. Apart from the fact that the authenticity of a Hadith in respect of a particular matter is seldom free from dispute, even the established practice of the Prophet in certain matters was departed from by some of the Khulafa-e-Rashidin, particularly Umar. Quite a respectable number of such instances have been stated in an excellent treatise in Urdu entitled "The Principle of Law-making in Islam", published by the Idara Tolu-e-Islam, Karachi, from which I have derived great benefit. The correct attitude towards the interpretation of Muslim law as illustrated by Sunnat, if I may venture to give an opinion, would be to regard it as changeable in detail to suit the requirements of time and place. In fact, I am not giving an opinion, but indicating actual practice. It is not necessary for me to say here that the argument for Sunnat being based on revelation is not well founded.

The book referred to above is

(Islam Mayy Kaanoon Saazi Kaa Assool.)

Nazim, Idara Tolu-e-Islam.
25-B. Gulberg II, Lahore.

concept of Makafat-e-Amal, of reward and retribution on the day of judgement crumbles down if there is compulsion in Deen.

In Sura Aal-e-Imran (3:78) it is stated that even the Nabi has no authority to force people to obey him and not Allah. He has been asked to tell the people that they should help nourish one another through obedience to the Book (Quran)

In Sura Al-Shams (91:7,8,9) it is said:

"The Self has been so ordered and proportioned that it contains within itself the option to follow the wrong path and disintegrate its 'Self' (Human Personality), or protect itself from disintegration and achieve success and purpose of life,"

The Ayat clearly points to the freedom of man to choose the path he wills. Through the messengers, Allah has clearly shown the vices and virtues and their consequences. It is upto us, Muslims and non-Muslims, to traverse the path we consider fit.

The Quran further says:

"If it had been the Lord's will, they would all have believed --- All who are on earth. Wilt thou then compel mankind against their will to believe?" (10:99)

There cannot be any directive more precise and clear then what the above Ayat contains. It is a lesson to those who assume the authority of interpreting Islam according to their whim and fancy, for their own benefit. The ignorant masses are coerced into believing what these bigots assert and are ultimately devoid of realising the true spirit of Islam. Another damaging effect of this coercion is the inherent damage it causes to the full development of man's capacities and abilities. The Quran is objective and universal in its outlook. It seeks the welfare of all humanity and not only of a particular sect or community.

Instead of using force and coercion to compel people into submission to Allah's laws, a logical and convincing attitude would be more sane and beneficial to the cause of Islam. The world already has a dark image of Islam only because the right perspective has not been presented to them. Every act of terrorism and destruction is attributed to the 'Islamic fundamentalists'. As long as we allow the propagation of bigoted and wrongly interpreted views on Islam, this tragedy will continue unabated.

According to Allama G.A. Parwez 'Allah has been repeatedly mentioned as Rabb-ul-Aalameen, the Cherisher and Sustainer of the worlds. It has to be realised by all that out of dust rose Adam and out of good deeds, as per laws of Allah, would rise the man in the world hereafter'.

labours of others. It must also be realized that the division of humanity is 'Shirk' and totally against the Quranic concept of one humanity.

"The whole of humanity is one entity" (2:213)

and

"That which benefits humanity as a whole, endures on this earth" (13:17)

Man enjoys real and not illusory freedom; he is responsible for all that he does, feels or thinks. He has to bear the consequences of his acts and carry his own burden.

The Quran says:

"For every self is that which it has earned, and against it only that for which it has worked" (2:286)

The misinterpreted ayat from Sura Baqara (2:256) says:

"There is no compulsion in religion. Truth stands out clear from error. Whoever rejects evil and believes in Allah, hath grasped the most trustworthy hand-hold which will never break. Allah is Hearer and Knower of all things".

This ayat applies to all, Muslims and non-Muslims, and cannot be restricted to the Muslims vis-a-vis non-Muslims. The earlier ayat (2:255) explains the sole authority of Allah in the universe and clearly states that no one can partake of his knowledge except through the method prescribed by him. His authority encompasses the entire universe which he maintains untiringly. It is clear that if Allah the possessor of such might, had desired then his order would have been established in the human sphere as it is in the natural sphere; but he did not wish to exercise compulsion. He made the right and wrong paths clear and left man free to choose either. The two ways have *also been mentioned in Sura Al-Balad (90:10) as 'Two highways'*

Sura Al-Kahaf (18:29) says:

"Say: *It is the truth from the Lord of you all. Then whosoever will, let him believe, and whosoever will, let him disbelieve*"

A great majority of Muslims are involved in 'Shirk' and have devised their own deities whom they associate with Allah. They stick to their beliefs which are surely repugnant to the Islamic concept of Tauheed. The ayat from Sura Baqara (2:256) will apply to them as well, as they cannot be compelled to take the right path.

I remember the Imam of a mosque in Jeddah complaining about fewer people coming for Fajr prayers when there is no compulsion from officials to offer Salat. During the daytime shop keepers and citizens are compelled to offer Salat. The basic concept of Islam is to believe in it with total conviction and committment, and no amount of compulsion can change a man's heart (Muslim or non-Muslim). The whole

COMPULSION IN ISLAM

By

Prof. Mohammed Rafi

****

There is a general misconception about the concept of compulsion in Islam. Since childhood I have been told that it was against the basic principles of Islam to forcibly convert a non-Muslim to the Islamic faith, but along with this there is the fallible belief that Muslims can be compelled in matters of Deen. This has always been exploited by bigots and the so called scholars of Islam to impose their narrow minded and sectarian beliefs on the ignorant masses. This deliberate and un-Islamic attitude has resulted in a completely changed comprehension of the true Deen-e-Islam. Consequently obedience to Allah has taken the back seat and people have fragmented into religions, sects and groups, who are more concerned with man's submission to their authority in religion rather than a straight forward and enlightened understanding and application of Islam. This attitude has also created permanent hurdles in the propagation of Islam.

The failures and frustrations of mankind, all the destructions and bloodshed that the world has suffered can be traced back to the fallacious views of life and religion that man adopted through the distorted vision and perverse thinking. Since 1947, this is exactly what has been happening in Pakistan. The 'Ulema' who were against Pakistan's creation took over the religious realm of the countrymen and unauthorizedly bifurcated Islam into personal, criminal and civil laws. The slightest deviation from their interpretation of Islam is a cardinal sin in our society. They have always justified their views from the religious angle and have narrowed Islam to a religion of rituals only. The Quran specifically declares that no state, society, sect or individual has the right to claim obedience from any person. Islam does not permit exploitation of man by man. Man is not supposed to take undue advantage of the

REFERENCES

1. *Berdeau:* The Divine and the Human
2. *Brend:* Foundations of Human Conflict
3. *Buber, Martin:* Between Man and Man
4. *Cobban, Alfred:* The Crisis of Civilization
5. *Haldan, J.S.:* The Philosophical Basis of Biology
6. *Hill, A.V.:* The Physical Reasonableness of Life
7. *Johnson, R.F.:* Confucianism and Modern China
8. *Kierkegaard:* The Present Age
9. *Moore, Thomas:* Personal Mental Hygiene
10. *Paul, Leslei:* Annihilation of Man
11. *Parvez, G.A.:* What Man Has Thought (Urdu Version)
12. *Parvez, G.A.:* Islam a Challenge to Religion
13. *Simpson, G.G.:* The Meaning of Evolution
14. *Time—Special Issue:* The New Age of Discovery, January, 1998
15. *Toynbee, Arnold J.:* The World and the West
16. *Turner, H.H.:* Introduction to the Foundations of Einstein's Theory of Gravitation.

Cosmic Process.

At present discussion emerges out of the question: why the Qur'anic Social Order which assures a peaceful, prosperous and glorious life to mankind has not been established anywhere in the world, not even in any Muslim state, although the Divine Guidance, enshrined in the Holy Qur'an, has been with us for fourteen centuries. The answer corroborative of the phenomenon is that cosmic process is slow, very slow when measured by serial or historic time. The point requires further elucidation. Evolutionary changes take place in the outer universe automatically, according to Divine plan, and by stages, each involving thousand and thousand of years to accomplish. This is ***cosmic process.*** In the case of man, however, this process works in a somewhat different way. Man (and here we mean man not travelling in the light of Divine guidance) when pressed by circumstances to modify any existing state of affairs, adopts a course which he thinks the best, works on it strenuously day in and day out, but finds at the end that the course adopted was wrong. He abandons it and embarks upon another course. This he has to repeat time and again. Often he feels exhausted during the course of his journey and leaves the experiment incomplete in dire frustration. Even when he reaches his destination, the labor involved and the time spent do not commensurate with the results achieved—the span of human life is so short and the distance to be traversed so lengthy. This process of "trial and error" is another form of cosmic process. Man has, however, not been left in wilderness to find his way out, un-aided by a guide or without any signposts on his way. He has been blessed with Divine guidance. If he adopts the course suggested by it straightaway, not only is he protected against pitfalls but the time taken to reach the goal also shrinks from ***cosmic reckoning*** to ***human calendar.*** Fourteen hundred years ago, a group of believers made this experiment most successfully, which, apart from the miraculous results it produced, proved that neither the Qur'anic Social Order was a utopia nor the program laid down to establish it was unworkable. Their later generations, however, abandoned that course; with the result that they met the same fate as did the past nations who acted similarly. (This, by the way, is the negative proof of the efficacy of the Divine Law governing the rise and fall of nations). The Divine course is still there and can be taken up by any nation who wished to reach human destination safely and within the shortest possible time:

> Say: The truth from your *Rabb* is there; so let whosoever will accept, and let whosoever will reject (The Qur'an 18:29).

So why to waste time and shed blood! That nation will survive which strives to assure ***for all men*** a life of happiness, peace and prosperity. Armed might, control over the forces of nature and wealth will not avail a nation if its policies are detrimental to the interest of mankind. It is bound to pass away, for

> Only that remains which is beneficial for ***mankind*** as a whole (The Qur'an 13:17).

human reason acting in the light of Revelation enshrined in Qur'an cannot miss the right path.

Approach to the Qur'an.

For this purpose our first task is to understand the real meaning of the Qur'an with the help of all the intellectual faculties we possess. We can then proceed to assess the value of its teaching. How are we to test the truth and usefulness of the Qur'anic teaching? The Qur'an itself helps us to answer this question. It proposes three ways in which it may be tested and offers to abide by the results of these tests. It is significant that the tests proposed are all acceptable to reason. Nowhere is the supernatural invoked. The appeal is invariably to human reason and experience.

Before proceeding to consider the tests, let us recapitulate the teaching of the Qur'an. The Qur'an enjoins man to believe in God, to follow His laws, to believe in one's own self, to love and serve his fellow-beings, to act in a virtuous manner so as to develop and express the best in him, and finally to believe in and prepare for the Hereafter. All these we are invited to test in the light of reason. Is there anything in this teaching that is repugnant to reason? No doubt it is possible to doubt the existence of God and the reality of the Hereafter. But then, it is also possible to doubt the existence of the world. There is no conclusive proof of the existence of objective world and some philosophers have argued, in all seriousness, that belief in such a world is unjustified. All that we can be sure of is the actual momentary sensation. In spite of philosophical arguments our belief in objective reality remains unshaken. Life pays little heed to the cobwebs of such philosophers. The point to bear in mind is that suprarational realities are not less real because they cannot be proved by logical arguments. In applying the rational test it is permissible to ask whether there is anything in the teaching, which runs counter to reason and to that part of human knowledge which commands universal acceptance. The question as to whether every element in it can be logically proved is inadmissible, because, the teaching, if it is to be true to its nature, cannot avoid reference to realities, which transcend reason. In this case, the rational test will take the form of determining whether or not the teaching is in direct conflict with reason and whether it furthers the interests of humanity. It is needless to say that the Qur'an has stood the test of reason and proved itself to be in harmony with the best in man:

> Say (O Muhammad! To the unbelievers): I say not unto you (that) I possess the treasures of Allah, nor that I have knowledge of the unseen, and I say not unto you: Lo I am *malak*. I follow only that which is revealed to me.
> Say: are the blind man and the seer equal? Will ye not then reflect on this? (The Qur'an 6:50, 11:24)

Secondly, the Qur'an invites people to judge it in the light of history. It asks them to ponder over the rise and fall of nations. It assures them that if they seek the causes of the downfall of a people, they will find that the people had contravened the principles of right conduct and permanent values, which were communicated to them by the *Nabi* of their age. Right belief and right conduct enable a nation to rise to power and wrong beliefs and actions lead to its downfall. Time and again the Qur'anic teaching, which confirms the teaching of earlier *Anbiya*, was put to the test and was found to be a trustworthy guide to the good life. People who rejected it and followed the wrong path inevitably fell into decay and were overtaken by a dreadful

whether it would lead him to the destination sought or to the caverns of destruction and annihilation. But before reaching its farther end, he finds that cognizance of the ultimate reality is beyond the scope of human intellect. Hence man follows the way opened to him, faces dacoits and buccaneers, combats with the beasts of the jungle where the brutalities of wilderness in man, find blood streams gushing out during the clashes, and the humanity broken, tortured, exploited. But the human thought remains outpouring continuously. Sometimes it so happens that the way he has been moving to, leads to somewhere else he did not visualize earlier. These are the halts where the human thought reclines deadly tired and consequently the Western thought is now searching for these refuges like the 'Rosicrucians', the 'mystics', the 'sages', the 'hermits' folds at present.

The Problem in Real Sense.

The question is whether the human thought be left to itself to operate on the process of hit and trial or there is any other mechanism which leads the humanity to its goal of life. In other words: is he endowed with the faculty to really solve the problems compatibly to the urges of his life he has? If man has no other means leading him confidently and safely to his destination, there is no alternative except his own hit and trial mechanism and hence the calamities and disasters so encountered be faced bravely with perfect calm and patience. Compulsion has no remedy in the world. But if there is a way leading man to his destiny safe and sound, it would surely be a psychopath who would not prefer to follow it. This problem has become the real crux of the matter today.

The fact is that man is a finite being and the powers with which he is endowed are necessarily limited in scope. Human reason is no exception. It has serious limitations. But the glorious successes of reason led man to over-estimate its capacity: he expected that reason would give him absolute knowledge. When this expectation was not fulfilled, he became disillusioned with reason and went to the other extreme in rejecting reason outright and forgot that only a few aspects of reality are accessible to reason and reality has an infinity of aspects. There is also no denying the fact that human reason can subdue the forces of nature—the history has proved it—but this is also a stark fact that it cannot find by itself a satisfactory solution to the complexity of the problems of mankind, even its manifestations, the sciences, do not and cannot possibly help to solve these problems of human life. If a nation adopts a wrong course of action, it may be years before it begins to experience its effects because reason can legitimately function within its own sphere and ceases to be reliable the moment it steps beyond it. We can put it to the best only when we know what it can do and what it cannot.

As indicated earlier we are witnessing the violent reaction against reason today. After a long period of unquestioned supremacy, its authority was challenged from various quarters: mystics, philosophers, scientists, psychologists because according to them, the intellect is compelled to invent specious reasons to justify the irrational operations of unconscious desires. Reason functions according to the role one gives it.

In voyaging across the uncharted seas of existence, the man cannot depend solely on the fitful flickering light of reason. The Qur'an sets forth a sustaining practical program for this inviting enterprise—the reason—and corroborates that

understand. It was invisibly a plague to him and now, wherever he goes; it follows him advertently or inadvertently. This was both a melee and affray within human reason and his desires, and made human thought awfully peevish and petulant.

Mysticism or Religion.

To get rid of this affliction, he coined a series of arcane techniques but of no use. He became so confused of the hardened crust of the way of his life, the extended journey he traversed, the intensity of the conflicts he encountered and the difficulty of the new mixed metaphors in his life that he decided to bereave his own intellect and opt for something else, irrational and illogical, the taken-for-granted paradigm.

He, within the fold of his own vision close to the lap of an ice-covered mountain of reason and rhyme, saw an enchanting orchard bestowing shady groves, showering cold winds with peaceful calm rivulets and providing silence and solace with absolutely no sigh of any leaf. Enchantingly he jumped there and felt so sleepy that he forgot the spectrum of his own goal and destination he had been endeavouring so far. This fascinative, intoxicative, rapturous and solace-infusing orchard is the mysticism, which the tired philosophers of the West termed as religion and God. To human thought, this is now the ultimate consequence of the human conflicts and the final answer to all those questions, which have kept him, perplexed throughout the whole of his life career. This is the halt where the human vision has put up today.

Basic Infirmity of Human Thought.

But this is not the first halt in the life span of human thought where he has made this alluringly intoxicating envisioned garden the product of his life. So often this has happened earlier that whenever he confoundingly became tired of the hard realities and wearisome conflicts of life, he opted for escape. Mysticism (the other name of personal concept of God and religion) is the last resort to escapism. Even the history of human thought stands witness to this fact that the horn of tranquility has never been any cause of solace for a long period of time to the human thought. Now, after he passed the plateau of tiring mental activity, he has again started probing for virtuous satisfaction and real consolation; so the western philosopher, perplexed with the conflicting state of life today, is searching for the blissful solace in the garb of religion, which could not be any cause of satisfaction any longer. He would, in real sense again come out in the search of that ideal world where he hopes he might find the satisfying solution to those problems which have kept him in the state of agony, grief and restiveness for the whole of his life.

These are the multi-variate issues of human life for the solution of which the human thought has traversed such a long mental journey and these are the halts where he has stood today awe-struck, confounded and is wandering about in a depressed state of mind! He will again come forward and take initiative to start his mental traverse. This is not despising to him. On the contrary these trails of human thought are appreciative and facilitative. If you have to weigh and watch of what he brought; just visit the Negroes of Africa or America and Australia and the high sounding philosopher and inventing scientist in the contemporary world, the difference of the mental vision/horizon found in the mores and cores of these two segments of people would make it clear that all this has become possible only due to this tedious and long intellectual journey of the human thought, and this constant struggle is a thing of beauty as a joy for ever. But the basic infirmity of the human thought is that man proceeds on the axiom of hit and trial

human ills and misfortunes? He reflected deeply over these issues. But his insight was trapped when he found that the solution, he discovered was itself a riddle of a perplexing enigma. He searched for other pragmatic solutions but soon became disparaged and discouraged of what he had invented. Now his final analysis of the things is that "good" is what synchronizes permanent values and "evil" is what is discordant to these values. Here again new questions popped up: what are the permanent values? Why are these permanent? Where do these values come from? Unfortunately the human reason could not answer these questions. He is, at present, awfully wonder-struck at this point and finds no clues to these questions.

Politics: The Form of Governance.

Then this trail of human thought caught another question: when the man has to live his life socially on this biosphere, which form of governance be lived so that there be no wedges of human interests creating clashes and chaos among the contending groups of masses? It was confoundingly a confusing question to him. The human mind struggled days in and days out for its satisfactory solution but enchanted every time by the solutions he discovered he remained deceptively oligarchic. Now he is of the view that there should be a universal law operative in the universe under a single state of the whole of mankind. He had not moved further when other questions clasped his faculty: which would be the universal law that could entail satisfaction to the confronting and contradicting segregations of the human beings? From where would that law be made available? And what would be the pragmatic test of the fact that this law accomplished what it purports to accomplish? He is today wonder-struck standing and reclining at the crossroads of life he wants to live by.

Economics: Dissipation of Earnings.

Then, there came again another problem of the same similitude and magnitude: basic needs of human life are limited but the area of his rapacious desires and wants for more than what he needs abounds the very limits imposed on, then how could that be managed, so that the entrepreneurial aspect of the society is not hampered and consequently every body is provided with the necessities of life smoothly? Seemingly it was a basic problem to the human vision but its satisfying answer put the human thought in the whirlpool of chaos and confusion to the extent that though he spent a lot of his time and energy on its solution, it remained paradoxically a quagmire for the human intellect. The human faculty could neither solve it nor it was empowered potentially to solve it. Today the human reason is standing at the confounding crossroads where one school of thought says 'depriving man of his hard earnings is an injustice to him' and the second school of though roars 'every one should work to the best of his potential and be given only what is enough for him to make his both ends meet'. The human reason is awe-struck on this crucial point and is probing the way to proceed righteously further and farther. This was the economic aspect of human life and reflected no exception to the multi-variate impediments the human reason has been confronting incessantly on the walk of life.

Internal Conflicts Within Man.

Though confused, man never forgot to exercise the option of his choice and will. In doing so he got trapped on way to his path where there was no external danger encountering him; it was only the will-o'-the-wisp clung to the apron of his intellect at every measure he suggested. It was his new adversary whom he did not

CONFLICTS AND CONTRADICTIONS IN HUMAN THOUGHT AND THE APPROACH TO THE HOLY QURAN

By
Prof. Dr. Manzoor-ul-Haque
Director Research and Publications
Faculty of Education, University of Sindh,
Elsa Kazi Campus, Hyderabad

****

The Trail of human thought, from Grecian to the most recent time philosophers and scientists, is fraught with conflicts and contradictions. In the beginning, the universe in its nature, to the human thought, was simply a dune of inanimate clay.

Nature of Universe.

Now it is found that it is not such a heap of clay but a "pure movement" or "abstract energy" in its origin. It brought two questions to the human thought: what is the origin of the absolute energy; how the diversified fickleness and wondrously awe-inspiring novelties gushing forth? The human mind to these questions is still struck with awe and finds no head or tail of what he has discovered over years for understanding the nature of universe.

Life and Consciousness.

The human mind pondered over the nature of life and consciousness, and eventually concluded that it came out of itself merely on the basis of mechanistic process of its evolution from the organic matter, but when maturity prevailed over his experiments and experiences, he changed his mind and inferred that life and consciousness can never be the outcome of this mechanistic process; it has its origin somewhere else. Again the searching question to the mind was "where does lie its origin? The human thought till now finds no clue to it to go ahead.

Ethics: Good and Evil in Life.

The other questions flashed in the human mind were about the occurrence of the events: why does man labor under the vicissitudes of calamities and misfortunes? Why is he yoked in the well of life as an oppressed and suppressed person? Eventually what is his fault in case of failure? Why is evil let loose in the universe? Why does 'good' not prevail everywhere? What is, ultimately, the remedy to the